Dr.Shyama Prasad Mukherjee University,Ranchi

BA Semester -6

Sun:- Urdu, Paper15

مندرجہ ذیل سوالات کے جواب دیجئے۔

1- قصیدے کے اجزائے ترکیبی عموماً کتنے ہوتے ہیں؟

(الف) پانچ (ب) دس (ج) آٹھ

2- قصیدہ لفظ کس سے نکلا ہے؟

(الف) حسد (ب) قصد (ج) سمد

3- سحر البیان کے مصنف کا کیا نام ہے؟

(الف) میر ضاحک حسن (ب) میر حسن (ج) انیسؔ

4- میر حسن کا اصل نام کیا تھا؟

(الف) میر خلیق (ب) میر غلام حسن (ج) میر ضاحک حسن

5- میر حسن کے والد کا کیا نام تھا؟

(الف) میر ضاحک حسن (ب) میر غلام حسن (ج) مرزا سلامت علی دبیرؔ

6- مثنوی کے لغوی معنیٰ کیا ہوتا ہے؟

(الف) ''دو، دو'' (ب) ''تین، تین'' (ج) 'پانچ، پانچ'

7- مرثیہ کس زبان کا لفظ ہے؟

(الف) فارسی (ب) عربی (ج) انگریزی

8- مرثیہ کا معنیٰ کیا ہوتا ہے؟

(الف) رثا (ب) 'دودو' (ج) ہمدرد

9- مرثیہ کے اجزائے ترکیبی کتنے ہیں؟

(الف) دس (ب) آٹھ (ج) پانچ

10- ناولٹ ''اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجو'' کے مصنف کون ہیں؟

(الف) عصمت چغتائی (ب) قرۃ العین حیدر (ج) ڈاکٹر رشید جہاں

درج سوالوں کا جواب دیں۔

11 قصیدہ کی تعریف اور اس کے اجزائے ترکیبی پر روشنی ڈالئے؟

12 سودا کی قصیدہ نگاری سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجیے؟

13 میر حسن کی شاعری کی اہم خصوصیات بنان کیجیے؟

14 میر انیس کے حالاتِ زندگی پر ایک مختصر نوٹ لکھئے؟

15 انیس کی مرثیہ نگاری کی خوصویت بیان کیجیے؟

16 مرثیہ کسے کہتے ہیں؟ مرثیہ کی تعریف کرتے ہوئے اس کے اجزائے ترکیبی پر روشنی ڈالئے؟

17 قرۃ العین حیدر کا ناولیٹ ''اگلے جنم موہے بیٹیانہ کیجو'' سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجیے؟

18 ''تضحیک روزگار'' کے حوالے سے سودا کی قصیدہ نگاری پر روشنی ڈالئے؟

اکائی نمبر15: میر حسنؔ کی شاعری

ساخت

15.1 : اغراض و مقاصد

15.2 : تمہید

15.3 : میر حسن کی مثنوی کے اقتباسات کے جملہ پہلوؤں کا تجزیہ

15.3.1 حالات زندگی اور ذہنی تربیت

15.3.2 اقتباس، نجم النسا کے جوگن ہونے میں (سحرالبیان) متن

15.2.3 تشریح

15.4 : آپ نے کیا سیکھا

15.5 : اپنا امتحان خود لیجیے

15.6 : فرہنگ

15.7 : سوالوں کے جوابات

15.8 کتب برائے مطالعہ

15.1: اغراض و مقاصد

اس اکائی سے

- آپ میر حسن کے حالاتِ زندگی اور ذہنی تربیت سے واقف ہوسکیں گے۔
- میر حسن کے عہد کے ادبی و سیاسی پس منظر کا جائزہ لے سکیں گے۔
- مثنوی سحرالبیان کے اقتباس کے جملہ پہلوؤں کا تجزیہ کرسکیں گے۔
- میر حسن کی شاعری کی قدر و قیمت متعین کرسکیں گے۔

15.2: تمہید

نادر شاہ درّانی اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے دلی کو تباہ کردیا تھا۔ نتیجا یہ ہوا کہ مغل حکومت کے علاقے اور صوبے آزاد اور خود مختار ہوگئے۔ انگریز اور فرانسیسی طاقت پکڑ گئے تھے ایسٹ انڈیا کمپنی کی 1767 کی پلاسی کی جیت سے اس کے حوصلے بہت بڑھ

Scanned by CamScanner

گئے۔ شاہ عالم الہ آباد میں نظر بند کردیے گئے۔ نئی نئی حکومتیں بنیں ان میں اودھ کی حکومت بھی تھی۔ نواب شجاع الدولہ نے دہلی سے شاعروں، کاری گروں اور دوسرے لوگوں کو بلاکر اپنے دربار کی رونق بڑھائی۔ میر حسن کے والد میر ضاحک، سودا، سوز اور بعد میں میر بھی لکھنؤ چلے گئے۔ شجاع الدولہ کے بعد آصف الدولہ نواب ہوئے اردو شاعری کو مزید تقویت ملی۔ وہ خود بھی شاعر تھے اور میر سوز کے شاگرد تھے۔ ابھی سودا اور میر کا زمانہ ختم نہیں ہوا تھا کہ لکھنؤ کے افق پر نئے ستارے چمکے۔ مصحفی، جرأت اور انشا جن کے چرچے دہلی میں شروع ہوچکے تھے یہاں اپنی شاعری کا سکّہ جمادیا۔ اسی زمانے میں دوسرے شعرا کے ساتھ میر حسن کو بھی بہت اہمیت حاصل ہے۔ انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں اور شاعروں کا تذکرہ بھی تصنیف کیا ہے۔ ان کی اصل شہرت ان کی مثنویوں کی وجہ سے ہوئی جن میں مثنوی ''سحر البیان'' خصوصاً قابلِ ذکر ہے۔ یہ مثنوی قصے کے لحاظ سے کو پر لطف ہے ہی، اس سے اس وقت کے رسم و رواج، رہن سہن، علم وفن اور زندگی کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ سحر البیان میں جذبات کا بیان سچے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مناظرِ قدرت کے تصویر کشی بھی کمال کی ہے۔

15.3: سحر البیان کے اقتباس کے جملہ پہلوؤں کا تجزیاتی مطالعہ

15.3.1 حالات زندگی اور ذہنی تربیت

میر حسؔن کا اصلی نام میر غلام حسن تھا۔ ان کے والد کا نام میر ضاحک تھا جو اپنے زمانے کے مرثیہ گو شاعر تھے۔ ان کے مورثِ اعلا میر امامی موسوی ہرات کے مشہور خانوادہ سادات سے تھے۔ یہ لوگ شاہ جہاں کے عہدِ حکومت میں ہرات سے ہندوستان آئے اور دہلی میں سکونت اختیار کر لی۔ ان کی ولادت کی تاریخ کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ جمیل جالبی نے محمود شیرانی کے حوالے سے تحریر کیا ہے کہ: میر حسؔن پرانی دلّی کے محلّہ سید واڑہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی پیدائش کے سال کے بارے میں ناقدین کی آرائیں اختلاف پایا جاتا ہے پھر بھی محققین کی آرأ کا تجزیہ کرتے ہوئے اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ان کی پیدائش 37-1736 اور 42-1741 کے درمیان ہوئی ہوگی۔ زمانے کے چلن کے مطابق انہوں نے بھی تعلیم حاصل کی اور اوائل عمر سے ہی شعر کہنے لگے۔

اٹھارویں صدی کی چوتھی اور پانچویں دہائی میں احمد شاہ ابدالی اور نادر شاہ درانی کے حملوں نے دلی والوں کا عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ اس وقت دہلی کے مقابلے اودھ، حیدرآباد اور بنگال کی ریاستیں زیادہ محفوظ اورامن و امان والی تھیں۔ چوں کہ انسان بنیادی اعتبار سے امن پسند واقع ہوا ہے، اس لیے کہیں بھی جب حالات نامساعد ہو جاتے ہیں تو وہ نقل مکانی کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ دہلی پر بار بار ہو رہی یورش سے تنگ آ کر شعرأ، ادبا اور دیگر صنعت کار آس پاس کی ریاستوں کی جانب رخ کر رہے تھے۔ دہلی کے بہت سے شعرأ، اس وقت قریبی ریاست اودھ کا رخ کر رہے تھے جو دہلی کے مقابلے پرسکون تھا اور نزدیک بھی۔ ایسے میں میر حسؔن کے والد نے بھی دہلی کو خیر آباد کہنے کا فیصلہ کیا۔

میر حسؔن اپنے والد کے ساتھ جب دلّی سے نکلے، اس وقت ان کی عمر ۲۵ سال کے آس پاس رہی ہوگی۔ دلّی چھوڑنا انہیں اس لیے

Scanned by CamScanner

گوارہ نہیں تھا کہ انہوں نے ایک بت سے دل لگا رکھا تھا۔ لیکن زندہ رہنے کے لیے دو وقت کی روٹی کا انتظام بھی ضروری ہے۔ دلّی سے ڈیگ، مکن پور ہوتے ہوئے لکھنؤ اور پھر لکھنؤ سے فیض آباد پہنچے۔ اس سفر کا ذکر میر حسؔن نے اپنی مثنوی ''گلزارِ اِرم'' میں کیا ہے، جس میں انہوں نے سفر کی داستان، ڈیگ میں تقریباً چار ماہ کے قیام، شاہ مدار کی چھڑیوں کے میلے اور پھر لکھنؤ میں وارد ہونے کا ذکر نہایت خوبی سے کیا ہے۔

اودھ حکومت کے بانی سعادت علی خاں برہان الملک نے 23-1722 میں موجودہ فیض آباد کو اپنی حکومت کی چھاؤنی بنایا تھا۔ انہوں نے اس بات کے لیے بڑی کوششیں کیں کہ یہ جگہ بغاوتوں سے دور اور مستحکم رہے۔ نواب شجاع الدولہ کے عہد (1754-75) میں فیض آباد میں عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ یہاں کی اسی پر امن فضا کو دیکھتے ہوئے دہلی کے بہت سے شعرا و ادبا نے اودھ کا رخ کیا، جن میں میر حسؔن بھی ایک ہیں۔

فیض آباد پہنچ کر میر حسؔن نے شجاع الدولہ کے ماموں نواب سالار جنگ بہادر کی ملازمت اختیار کی اور ان کے بیٹے نوازش علی خاں کے مصاحب بن گئے۔ نواب آصف الدولہ نے جب 1775 میں لکھنؤ کو اودھ کا پایۂ تخت بنایا تو ان کے ہمراہ ان کا تمام خاندان لکھنؤ آ بسا اور پھر کچھ عرصہ بعد میر حسؔن بھی اہل و عیال کے ساتھ لکھنؤ آ گئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ لکھنؤ ہی میں میر حسؔن نے اپنی عمر کے آخری ماہ و سال گزارے۔ یہیں 1786 کے محرم کے مہینے میں انتقال فرمایا اور مرزا قاسم علی خاں کے باغ کے پیچھے تدفین عمل میں آئی۔ ان کی بیماری اور آخری سفر کے بارے میں میر شیر علی افسوس سحرالبیان کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''آخر چرخِ تفرقہ پرداز نے باہم تفرقہ ڈالا۔ اتفاقاً میرا رومگار سنہ گیارہ سے ثمانوے میں صاحبِ عالم مرزا جواں بخت کی سرکار میں ہوا۔ میں اُن کے ہمراہ بنارس میں آیا۔ بعد اُس کے اُس بزرگ کو آخرِ ذی حج سنہ بارہ سے ہجری میں مرض الموت لاحق ہوا۔ مذان غرّۂ محرم کو، کہ سنہ بارہ سو ایک شروع ہو چکے تھے، اس دارِ فانی سے اُس نے سرائے جاودانی کو کوچ کیا، اور شہرِ لکھنؤ میں، مفتی گنج کے بیچ، مرزا قاسم علی خاں بہادر دام ظلّہ کے باغ کے پیچھے مدفون ہوا۔ خدائے کریم اُس کو یہاں دارالسلام عطا کرے اور وہاں قصرِ جنت بخشے۔''

(بحوالہ: سحرالبیان، دیباچہ از میر شیر علی افسوس، ص: ۱۲)

میر حسؔن نہایت نیک دل، خوش مزاج اور ملنسار انسان تھے، جن کی تمام عمر افلاس میں گزر گئی۔ جمیل جالبی نے شیر علی افسوس کی اس بات سے اتفاق نہیں کیا ہے کہ ''میر حسن علمِ مجلسی میں بے بدل تھے۔'' ان کا کہنا یہ ہے کہ ''اگر وہ بے بدل ہوتے تو سوداؔ کی طرح نوابین اور امرأ کو مٹھی میں لے کر ٹھاٹ باٹ کی زندگی بسر کرتے۔'' میر حسؔن کی مثنویوں کے مطالعے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں جنس مخالف، میلوں ٹھیلوں، سیر سپاٹوں اور کھیل تماشوں سے کافی دلچسپی تھی۔ کیوں کہ جہاں ان چیزوں کا ذکر آتا ہے وہاں ان کے قلم کی روانی اور شگفتگی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ میر حسن کی مثنوی پر دیباچہ لکھتے ہوئے میر شیر علی افسوس نے ان کی وضع قطع پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں:

Scanned by CamScanner

''میر حسن ڈاڑھی منڈواتے تھے، پر جامہ نمیہ اُن کا بھی ویسا ہی تھا، اور پگڑی کی بندش قدیم ہندوستان زاؤں کی سی۔ قد لمبا اور رنگ گندمی۔ ہر چند وضع تو ایسی تھی، پر شوخ مزاج ولطیفہ گو وے بھی تھے، نہ ہزّال و فحّاش۔ سوائے اس کے، بردباری اور ملنساری اُن کی خلقت میں تھی۔ کسی کو میں نے اُس عزیز سے شاکی نہیں پایا اور بیزار نہیں دیکھا۔''

(بحوالہ: سحرالبیان، دیباچہ از میر شیر علی افسوس، ص: ۱۰)

میر حسنؔ نے مثنویوں کے ساتھ ساتھ ایک تذکرہ یادگار چھوڑا ہے۔ جس میں انہوں نے قدیم شعرا سے اپنے عہد تک کے تقریباً تین سو شعرا کا ذکر مختصر طور پر پیش کیا ہے۔ میر حسنؔ کے چار بیٹے تھے اور چاروں میر مستحسن خلیقؔ، میر محسن محسنؔ، میر احسن خلقؔ اور سید احسان اللہ مخلوقؔ شاعر تھے۔ آگے چل کر یہی میر خلیقؔ اور ان کے بیٹے میر ببر علی انیسؔ نے مرثیہ گوئی میں شہرت دوام حاصل کی۔

15.3.2 شاعری کی خصوصیات

میر حسنؔ کو شاعری ورثہ میں ملی تھی۔ میر حسنؔ نے تقریباً تمام اصناف سخن یعنی مثنوی، غزل، قصیدہ، مرثیہ، رباعی وغیرہ میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کی اصل شہرت، ان کی مثنوی سحرالبیان کے باعث ہی ہے۔ اردو شاعری میں ایسی مثنوی بقول انہیں کے'' نہ ایسی ہوئی ہے نہ ہوگی کبھی'' والی بات حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ایسی کوئی مثنوی منظر عام پر نہ آ سکی جو اس سے کسی بھی طرح لگّا کھاتی ہو۔ ویسے تو انہوں نے چھوٹی بڑی بارہ مثنویاں کہی ہیں لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی شاہکار مثنوی ''سحر البیان'' ہی کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی کلیات میں سات قصیدے، بارہ مخمس، ایک ترکیب بند، ایک مسدس اور 145 رباعیاں شامل ہیں۔ ان کی مشہور اور طویل مثنویوں میں'' سحر البیان'' کے ساتھ ساتھ گلزارِ ارم اور رموز العارفین کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی بقیہ مثنویاں مختصر ہیں، جن کے نام یہ ہیں: دو احمق دوستوں کی نقل، کلانوت کی نقل، قصاب کی نقل، مثنوی شادی، در تہنیتِ عید، قصرِ جواہر، خوانِ نعمت اور ہجو حویلی میر حسن۔ ان کے قصیدوں اور مرثیوں کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی طبیعت کو ان سے وہ رچاؤ نہ تھا جیسا کہ مثنوی سے تھا البتہ ان کی غزلیں ادبی شان رکھتی ہیں۔ زبان و بیان، جزیات نگاری اور منظر نگاری میں سحر البیان اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتی۔ بیان کی صفائی، محاورے اور تاثیر یہ ایسی خوبیاں ہیں جو اس مثنوی کے برابر اردو کی کسی دوسری مثنوی میں نظر نہیں آتیں۔ محاورہ کا لطف، مضمون کی شوخی اور طرز ادا کی نزاکت اس مثنوی کی خصوصیات ہیں۔ زبان کی سادگی اور الفاظ کی بندش کا یہ حال ہے کہ سحر البیان کو منظرِ عام پر آئے دو سو سال سے زیادہ ہو چکے ہیں، اس کے باوجود وہ آج کی بولی جانے والی زبان لگتی ہے۔ اسلوب نہایت سادہ، چست اور رواں ہے۔ یہ مثنوی کہنے کو تو ایک منظوم عشقیہ کہانی ہے لیکن اس میں اس دور کی زندگی بالخصوص لکھنوی، معاشرت، رسوم و رواج، شادی بیاہ کی رسمیں، لباس، زیورات، رقص و سرود وغیرہ کی دلچسپ تفصیلات و جزئیات موجود ہیں۔ اس اعتبار سے یہ مثنوی اپنے دور کی ثقافتی تاریخ کا معتبر ماخذ بھی کہی جا سکتی ہے۔ دوسری قابل ذکر مثنوی ''گلزار ارم'' ہے، جس میں میر حسن نے دہلی سے لکھنؤ کے سفر کی

Scanned by CamScanner

روداد بیان کی ہے۔ ''تذکرہ شعرائے اردو'' بھی میر حسن کی اہم تصنیف ہے۔ یہ تذکرہ فارسی میں ہے۔

15.3.3 سحر البیان کا تعارف

اس مثنوی یعنی سحر البیان کے کہنے کا سبب جیسا کہ ناقدین نے تحریر کیا ہے کہ 'گلزارِ اِرم' کے وہ اشعار ہیں، جن میں میر حسؔن نے لکھنؤ کی تضحیک اور فیض آباد کی تعریف کی تھی۔ نواب آصف الدولہ بے پناہ دولت خرچ کر کے لکھنؤ کو دوسرا شاہجہان آباد بنانا چاہتے تھے۔ ایسے میں گلزارِ ارم جب ان کی نگاہ سے گزری تو وہ بہت رنجیدہ ہوئے اور اس کی پاداش میں میر حسؔن کو شہر سے باہر کر دیا گیا۔ جب میر حسؔن نے یہ مثنوی کہہ کر حضور کے سامنے پیش کی تب جا کر قصور معاف ہوا۔ سحر البیان کے مندرجہ ذیل اشعار بھی اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

فلک بار گاہا !ملک در گہا — جدا میں جو قدموں سے تیرے رہا
نہ کچھ عقل نے اور نہ تدبیر نے — رکھا مجھ کو محروم تقدیر نے
پر اب عقل نے میرے کھولے ہیں گوش — دیا ہے مدد نے تری مجھ کو ہوش
سو میں اک کہانی بنا کر نئی — دُرِ فکر سے گوندھ لڑیاں کئی
لے آیا ہوں خدمت میں بہرِ نیاز — یہ اُمّید ہے ، پھر کہ ہوں سر فراز
مِرا عذرِ تقصیر ہو وے قبوُل — بہ حقِّ علی و بہ آلِ رسوُل

یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ سحر البیان کے شہنشاہ گیتی پناہ کا کردار بھی آصف الدولہ ہی کو مدِّ نظر رکھ کر لکھا گیا ہے۔ کیوں کہ لاولدی کا معاملہ بھی انہیں سے جُڑا ہوا ہے اور ''سدا ماہ رویوں سے رغبت اسے'' کا قصہ بھی انہیں کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

اس مثنوی کا آغاز میر حسؔن نے اس دور کے چلن کے مطابق حمد سے کیا ہے۔ اس کے بعد ''نعت حضرت رِسالت پناہ کی''، ''منقبت حضرت امیرالمومنین کی''، '' تعریف اصحابِ پاک رضوان اللہِ علیہم''، ''مناجات''، ''تعریف سخن کی کرنے کے بعد اصل قصے کی طرف رخ کرتے ہیں اور'' مدح شاہ عالم بادشاہ کی'' رقم کرتے ہیں۔ شاہ عالم بادشاہ کی تعریف میں چند اشعار کہتے ہوئے ''مدح وزیر آصف الدولہ کی'' میں اپنی طبیعت کی جولانی اور بادشاہ کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مذکورہ تمام سرخیوں کو رقم کرتے ہوئے ''آغازِ داستان'' کرتے ہیں یعنی یہاں سے اصل قصے کا آغاز ہوتا ہے۔ کسی شہر میں ایک شہنشاہ رہتا تھا جو بہت عادل، سخی اور زبردست تھا۔ جس کے آگے بڑی بڑی سلطنتوں کے سربراہ سر جھکانے کے لیے مجبور ہو جاتے تھے۔ اس بادشاہ کو کسی طرح کا کوئی غم نہیں تھا سوائے اولاد کے۔ اس شہنشاہ کے دربار میں نجومی، رمال اور برہمن کو اکٹھا کر کے پیش کیا گیا اپنا دلی مدعا بیان کیا تو انہوں نے 'بچار' کر کے بتایا کہ آپ کے یہاں لڑکا پیدا ہوگا۔ پھر ان نجومیوں نے شمار کر کے یہ بھی بتایا کہ شاہ زادے کو ۱۲ سال تک باہر نہ نکلنے دیں کیوں کہ اسے بلندی سے خطرہ ہے۔ غرض اس 'ماہ رو' کو بارہ برس تک محل

Scanned by CamScanner

سے باہر اور کسی بلند مقام پر نہیں جانے دیا گیا۔ بارہ سال مکمل ہونے کے بعد محل میں جشن کا اہتمام کیا گیا اور خوشیاں اور رنگ رلیاں منائی گئیں۔ اس رات شہزادے نے محل کی چھت پر سونے کا منشا ظاہر کیا۔ چوں کہ نجومیوں نے جو کچھ بتایا تھا اس کے مطابق اب کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا، اس لیے شہزادے کو اجازت دے دی گئی۔ اتفاق سے 'ماہ رخ' پری اپنے اُڑن کھٹولے سے ادھر سے گزری تو شہزادے کے حسن کو دیکھ کر اس کی خواب گاہ میں چلی آئی۔ شہزادے کو سوتے میں ہی پیار کیا اور اپنے ساتھ لے اڑی۔ یہاں پرستان میں شہزادے کا دل بہلانے کے لیے ہر چند کے 'ماہ رخ' ہر طرح اس کا خیال رکھتی ہے پھر بھی محل کی محفلیں اس کو یاد آتی ہیں اور وہ چھپ چھپ کر رویا کرتا ہے۔ اس کی ایسی حالت دیکھ کر پری نے روزانہ شام کو اسے 'کل' کے گھوڑے پر سوار ہو، گھومنے کی اجازت دے دی۔ شہزادہ روزانہ ایسے ہی سیر کو نکلتا کہ ایک دن اس نے نہایت شاندار باغ دیکھا اور چپکے سے اس میں داخل ہو گیا۔ یہاں پہنچ کر اس کی ملاقات بدرِ منیر سے ہو جاتی ہے جو بہت ہی پر کشش حسن کی ملکہ ہے اور جس پر اس کا دل آجاتا ہے۔ اب شہزادہ روزانہ بدرِ منیر سے ملاقات کے لیے بے چین رہنے لگا۔ جس سے پری کو شبہ ہو گیا کہ اس نے کہیں اور دل لگا لیا ہے۔ ایسے میں اس نے بے نظیر کو قید کر لیا۔ اب جب کہ شہزادہ مقررہ وقت پر باغ میں بدرِ منیر کے نہیں پہنچا تو بدرِ منیر تڑپ اُٹھی اور شہزادے کو ڈھونڈ نکالنے کی تدبیریں کرنے لگی۔ شہزادے کو ڈھونڈنے میں بدرِ منیر کی ہم راز سہیلی اس کی مدد کو آگے آتی ہے۔ اس طرح یہ کہانی آگے بڑھتی ہے اور پھر مختلف کشمکش کے دور سے گزرتے ہوئے اختتام کو پہنچتی ہے اور ایک بار پھر محل میں ایسا جشن کا سماں ہوتا ہے کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔

اس مثنوی کا قصہ بظاہر میر حسؔن کا طبع زاد معلوم ہوتا ہے لیکن قدیم فارسی اور اردو داستانوں میں اس مثنوی کے مختلف اجزا مل جاتے ہیں۔ محققین نے قصہ چہار درویش، گلشنِ عشق اور الف لیلیٰ وغیرہ داستانوں سے مماثلتیں پیش کی ہیں لیکن اس کے باوجود انہوں نے جس طرح قدیم ادب سے استفادہ کرتے ہوئے سحر البیان کے قصے کو پیش کیا ہے، وہ ان کا اپنا معلوم ہوتا ہے۔ ان سب قدیم داستانوں سے فیض حاصل کر کے میر حسن نے وہ کارنامہ انجام دیا ہے کہ رہتی دنیا تک ان کا نام باقی رہے گا۔

میر حسؔن نے اس مثنوی کی زیادہ تر داستانوں کا آغاز جس طرح ساقی نامہ سے کیا ہے، اسی طرح اس قصہ یعنی 'شہزادے کا باغ میں جانا' بھی ساقی نامہ سے ہی رقم کیا ہے۔

یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ ہر داستان کے آغاز میں جس طرح حرفِ مدعا بیان کیا گیا ہے، اس سے نہ صرف یہ کہ داستان کا قصہ ہم پر واضح ہوتا ہے بلکہ قاری کی دلچسپی بھی برقرار رکھنے میں معاون ہوتا ہے۔ بے نظیر کے باغ میں پہنچنے اور اس کی دلی کیفیت کا اظہار میر حسؔن نے کچھ اس طرح کیا ہے:

کدھر ہے تو اے ساقیِ شوخ رنگ!   کہ آیا ہوں میں بیٹھے بیٹھے بہ تنگ
پلا مجھ کو دارو کوئی تیز و تند   کہ ہوتا چلا ہے مرا ذِہن کند
مرے توَسنِ طَبع کو پَر لگا   مجھے یھاں سے لے چل فلک پر اُڑا

Scanned by CamScanner

سنو ایک دن کی یہ تم واردات　　اُٹھا سیر کو بے نظیر ایک رات

بے نظیر کے باغ میں پہنچنے کا قصہ یوں ہے کہ جب وہ اپنے محل کی چھت پر سویا تھا، اس وقت ایک پری جس کا نام 'ماہ رخ' ہے۔ چھت پر سے گزرتی ہے اور اس کا بھبھوکا سا بدن دیکھ کر اس پر فریفتہ ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے اڑن کھٹولے سے نیچے اتر کر اسے پیار کرتی ہے اور پھر شاہ زادے کو پلنگ کے ساتھ پرستان میں لے کر روانہ ہو جاتی ہے۔ اگلے دن صبح جس وقت محل میں یہ خبر پھیلتی ہے، سارا محل غم و الم میں ڈوب جاتا ہے۔ ماں باپ اور تمام ملازم دکھ کا پیکر بن جاتے ہیں۔ اِدھر بے نظیر کی آنکھ اگلی صبح جب کھلتی ہے تو وہ حیران رہ جاتا ہے کہ خدارا میں یہ کہاں آ گیا؟ ہر چندوہ پری

اس کی دل جمعی کا ہر طرح خیال رکھتی ہے لیکن اس کے باوجود شہزادے کو اپنے محل کی یاد ستاتی رہتی ہے اور وہ اپنی پرانی محفلیں اور ٹھٹھولیوں کو یاد کر کے اس کے غم میں آنسو بہاتا رہتا ہے۔مثال کے طور پر:

کبھی اشک آنکھوں میں بھر لائے وہ　　کبھی سانس لے کر کہے ہائے وہ
وہ محلوں کی چُہلیں، وہ گھر سَماں　　رہے رو بہ رو دھیان میں ہر زماں
وہ شفقت جو ماں باپ کی یاد آئے　　تو راتوں کو رو رو کے دریا بہائے
کبھی اپنی تنہائی پر غم کرے　　کبھی اپنے اوپر دعا دم کرے
کرے یاد جب اپنے ناز و نِعَم　　فُغاں زیرِ لب وہ کرے دم بہ دم
بہانے سے دن رات سویا کرے　　نہ ہو جب کوئی، تب وہ رویا کرے

غرض شہزادے کو اس حال میں دیکھ ماہ رخ بھی پریشان ہونے لگی۔ کیوں کہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا محبوب اِس طرح رنجیدہ خاطر رہے۔ماہ رخ جس کو دل و جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہے اور جس کے لیے ہر طرح کا سامانِ عیش فراہم کرنے کے سو سو جتن کر رہی ہے ۔ اس کو غموں میں گھلتا دیکھ کیسے برداشت کر سکتی تھی۔شہزادے کی اس حالت کو بدلنے کے لیے اس نے شہزادے کو 'کل' کا گھوڑا فراہم کیا اور کہا کہ:

تو رُک رُک کے دل کو نہ کر اپنے بند　　نہ پہنچے کہیں تیرے جی کب گزَند
سرِ شام جاتی ہوں میں باپ پاس　　اکیلا تو رہتا ہے اِس جا اُداس
یہ گھوڑا میں دیتی ہوں کل کا تجھے　　و لیکن یہ دے تو مُچلکا مجھے
کہ گر شہر کی طرف جاوے کہیں　　وَیا، دل کسی سے لگاوے کہیں
تو پھر حال ہو جو گنہ گار کا　　وہی حال ہو تجھ سے دل دار کا

Scanned by CamScanner

مذکورہ اشعار سے یہ بات ظاہر ہے کہ 'ماہ رخ' نے، 'بے نظیر' کو اس بات کی اجازت دے دی ہے کہ وہ روزانہ شام کو 'کل' کے گھوڑے پر سوار ہو، زمین کی سیر کر آوے اور اس اجازت کے ساتھ اس بات کی ضمانت بھی اس سے لے لی کہ وہ کسی اور سے دل نہ لگاوے ورنہ وہ شہزادے کا حال گنہ گار کا سا کرے گی۔ اس کے بعد میر حسؔن نے اس گھوڑے کی تعریف کے لیے بھی چند اشعار قلم بند کیے ہیں اور اس کی تعریف جی کھول کر کی ہے۔ اس گھوڑے کا نام انہوں نے اس کی صفات کے مدِ نظر 'فلک سیر' رکھا ہے۔ اس گھوڑے پر سوار ہو کر بے نظیر روزانہ شام کو زمین کی سیر کو نکلتا ہے۔ اسی طرح ایک رات وہ 'فلک سیر' پر سوار ہو کر دنیا کی سیر کو نکلتا ہے تو اس کو ایک نہایت خوبصورت یا بقولِ میر حسن سہانا سا باغ نظر آتا ہے۔

اقتباس کا آغاز بے نظیر کی سیر اور سیر کرتے کرتے ایک ایسے باغ پر نظر پڑنے سے ہے جو انتہائی خوبصورت ہے۔ قصے میں ربط پیدا کرنے کے لیے پچھلے واقعات اور قصے کو مختصراً بیان کرنا اس لیے ضروری تھا کہ پوری کہانی ہمارے مدِ نظر رہے۔ اس سے ہمارے پیش نظر نہ صرف پوری کہانی رہے گی بلکہ اس سے آگے کی کہانی معلوم کرنے کے لیے تجسس بھی برقرار رہے گا۔

یہ ایک ایسا باغ ہے، جسے ہم خیالی باغ کہہ سکتے ہیں۔ لکھنؤ چوں کہ باغات کا شہر تھا، اس لیے ہمیں اس میں تھوڑی بہت اس کی جھلک دیکھائی دیتی ہے پھر بھی اس باغ کے تعلق سے اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اس طرح کے باغ کا وجود خیالات کی دنیا ہی میں ممکن ہے۔ کیوں کہ میر حسؔن نے جس طرح سے اس کی منظر کشی کی ہے، اسے دیکھتے ہوئے صرف اتنا عرض کیا جا سکتا ہے کہ یہ ایک نہایت حسین، دلکش اور انتہائی پرکشش باغ ہے، جسے دیکھتے ہی انسان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔ ایسے دلکش باغ کو دیکھتے ہی شاہ زادہ حیران رہ جاتا ہے کہ واللہ کیا باغ ہے۔ گھوڑے سے اتر کر چپکے سے دبے قدموں اس باغ میں داخل ہوتا ہے۔ تمام چیزوں سے نظریں بچائے ہوئے جیسے ہی اندر پہنچتا ہے، اس کی حیرانیوں میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس قدر خوش نما باغ، اس کی آرائش و زیبائش اس قدر متاثر ہوتا ہے کہ بس باغ کو کھڑا تکتا رہ جاتا ہے۔ یہاں میر حسؔن نے باغ کی خوبصورتی کو جس طرح سے بیان کیا ہے، وہ دیکھنے کے قابل ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ منظر کشی اور جزیات نگاری میں میر حسؔن کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ مثلاً:

سنو ایک دن کی یہ تم واردات — اُٹھا سیر کو بے نظیر ایک رات
ہوا ناگہاں اس کا اک جا گُزر — سُہانا سا اک باغ آیا نظر
سفید ایک دیکھی عمارت بلند — کہ تھی نور میں چاندنی سے دو چند
وہ چھٹکی ہوئی چاندنی جا بہ جا — وہ جاڑے کی آمد، وہ ٹھنڈی ہوا
وہ نکھرا فلک، اور مہ کا ظہور — لگا شام سے صبح تک وقتِ نور

اس باغ کی خوبصورتی دیکھنے کے بعد بے نظیر سب کچھ بھول جاتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ اب تو جو ہو، سو ہو۔ اس کے بعد وہ اس باغ کے ایک ایک حصے پر نظر دوڑاتا ہے اور حیرت و استعجاب میں ڈوبتا چلا جاتا ہے۔ اسی عالم میں چپکے چپکے وہ آگے بڑھتا چلا

Scanned by CamScanner

جاتا ہے اور اس کی حیرت میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اتنے میں بے نظیر کی نگاہ ایک ''رشکِ ماہ'' پر پڑتی ہے، جسے دیکھتے ہی اس کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد میر حسؔن نے جس طرح سے باغ کا منظر پیش کیا ہے، اسے دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ گویا وہ جنت کے باغات کا منظر بیان کر رہے ہیں۔ ''بدرِ منیر'' پر جیسے ہی بے نظیر کی نگاہ پڑتی ہے، اس پر سکتے کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ اس کے آگے کی داستان شاعر نے 'بدرِ منیر' کی خوبصورتی، اس کے لباس، اس کے رکھ رکھاؤ، لوازمات، آرائش و زیبائش کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

غرض اپنی صنعت سے تاروں کو توڑ — زمیں کو فلک کا بناتے تھے جوڑ
ہَوا میں وہ جگنو سے چمکیں بہم — مَلیں جلوۂ مہ کو زیرِ قدم
فقط چاندنی میں کہاں طَور یہ — کہ طرہ نہ جب تک ملے اور یہ
زمانہ زَر افشاں، ہَوا زَر فشاں — زمیں سے لگا تا سَما زَر فشاں
گُل و غُنچہ، نَسرین و تاجِ خروس — بزمینِ چمن سب، جبینِ عروس
خراماں زری پوش ہر ماہ وَش — کریں دیکھ کر مہر و مہ جن کو غَش
کھڑا ایک نمکیرۂ زر نگار — کہ تھے جس کی جھالر پہ موتی نثار

اس طرح کے خوبصورت باغ میں پہنچ کر بے نظیر متعجب نظروں سے چاروں طرف دیکھتا ہے۔ اور جدھر دیکھتا ہے ''زمیں نور کی آسماں نور کا، جدھر دیکھو اودھر سماں نور کا'' کا منظر نظر آتا ہے۔ ایسے میں سوچتا ہے کہ اب اس کی حقیقت سے بھی واقف ہونا چاہیے۔ یہ سوچ کر وہ آگے بڑھتا ہے۔ بدرِ منیر کو پیش کرنے میں میر حسؔن نے اپنی طبیعت کی جولانی خوب دکھائی ہے۔ بدرِ منیر کو انہوں نے جنت کی حور سے کم تر نہیں سمجھا ہے اور میر حسؔن کے بیان میں جتنا کچھ آ سکتا تھا، انہوں نے حتی المقدور بدرِ منیر کی تعریف میں رقم کر دیا ہے۔

15.3.4 سحرالبیان کا متن :اقتباس:

(داستان وارد ہونے میں بے نظیر کے بدرِ منیر کے باغ میں اور شاہ زادی کے عاشق ہونے میں)

کدھر ہے تو اے ساقیِ شوخ رنگ! — کہ آیا ہوں میں بیٹھے بیٹھے بہ تنگ
پلا مجھ کو دارو کوئی تیز و تند — کہ ہوتا چلا ہے مرا ذِہن کُند
مرے تَوسَنِ طَبع کو پَر لگا — مجھے یہاں سے لے چل فلک پر اُڑا
سُنو ایک دن کی یہ تم وارِدات — اٹھا سَیر کو بے نظیر ایک رات

Scanned by CamScanner

ہوا نا گہاں اُس کا اک جا گُزر — سُہانا سا اک باغ آیا نظر
سفید ایک دیکھی عمارت بلند — کہ تھی نور میں چاندنی سے دو چند
وہ چھٹکی ہوئی چاندنی جا بہ جا — وہ جاڑے کی آمد ،وہ ٹھنڈی ہَوا
وہ نکھرا فلک اور مہ کا ظہور — لگا شام سے صبح تک وقتِ نور
یہ عالم جو بھایا ،تو کوٹھے پہ آ — اتر اپنے گھوڑے سے اور سر جھکا
لگا جھانکنے اس مکاں کے تئیں — کہ دیکھوں تو، یہاں کوئی ہے یا نہیں
جو دیکھے تو ایسا کچھ آیا نظر — کہ سب کچھ گیا اُس کے جی سے اُتر
کہا جی سے، اب تو جو کچھ ہو سو ہو — ذرا چل کے اِس سَیر کو دیکھ لو
یہ کہہ، نیچے اترا دبے پانو وہ — نظر سے بچائے ہوئے چھانو وہ
الگ کھول ہاتھوں سے وھاں کا کواڑ — چلا سا یہ سایہ درختوں کی آڑ
تھے اک طرف گنجان باہم درخت — کہ لپٹے ہوں جس طرح مُشتاق سخت
لگا وھاں سے چھپ چھپ کے کرنے نظر — درختوں سے جوں ماہ ہو جلوہ گر
عجب صورتیں، اور طُرفہ محَل — چلا، دیکھتے ہی، دل اس کا نکل
ملی جنس کی اس کو جو اپنی بو — لگا تکنے حیرت سے حیران ہو
نظرآئی وھاں چاندنی کی بہار — کہ آنکھوں نے کی خیرَ گی اِختیار
در و بام یک لخت سارے سفید — ہر اک طاق، محراب صبحِ اُمید
مغرّق زمیں پر تمامی کا فرش — جھلک جس کی لے فرش سے تا بہ عرش
زمیں کا طَبَق آسماں کا طَبَق — سُنہری ،رُپہری ہو جیسے ورق
بلوریں دھرے ہر طرف سنگِ فرش — کہ جس سے مُنوّر رہے رنگِ فرش
گئی اُس کے عالَم پہ جس دم نگاہ — اور آیا نظر اُس کو اک رشکِ ماہ
طرح اس کی، ہر دل کی مانوس تھی — کہ گویا وہ شیشے کی فانوس تھی
کہیں ،دیکھ اس کے تئیں ہوش مند! — پری کو کیا ہے گا شیشے میں بند

Scanned by CamScanner

ہر اک سمت واں نور کا ازدحام
لگے آئینے قدِ آدم تمام

لپیٹے ہوئے بادلوں سے ردخت
زمین و ہوا، صاحبِ تاج و تخت

مُلمّع وہ چوپڑکی پاکیزہ نہر
پڑے چشمۂ ماہ سے جس میں لہر

لبِ نہر پر صاف جو غور کی
توپٹری تھی وہ ایک بلّور کی

پڑے اس میں فوّارے چھٹتے ہوئے
ہوا بیچ موتی سے لٹتے ہوئے

مُقرّض پڑا اُس میں مُقیّش جو
گرا ماہ وہاں رشک سے پُرزے ہوئے

لیے گود مُقیّش چھوٹے بڑے
سبھی مہ، ستارے اڑاویں کھڑے

غرض اپنی صنعت سے تاروں کو توڑ
زمیں کو فلک کا بناتے تھے جوڑ

ہوا میں وہ جگنو سے چمکیں بہم
ملیں جلوۂ مہ کو زیرِ قدم

فقط چاندنی میں کہاں طور یہ
کہ طُرّہ نہ جب تک ملے اور یہ

زمانہ زرافشاں، ہوا زرفشاں
زمیں سے لگا تا سما زرفشاں

گُل و غُنچہ، نسرین و تاجِ خروس
زمینِ چمن سب، جبینِ عروس

خراماں زری پوش ہر ماہ وش
کریں دیکھ کر مہرومہ جن کو غش

کھڑا ایک نمگیرۂ زرنگار
کہ تھے جس کی جھالر پہ موتی نثار

جڑاؤ وہ استادے الماس کے
ڈھلے ایک سانچے کے، اک راس کے

کھنچی ڈور ہر طرف زرتار کی
لڑی جوں کناری کے ہوں ہار کی

کہوں کیا میں جھالر کی اُس کی پھبن
کہ سورج کے ہو گرد جیسے کرن

مُغرّق بچھی مسند اک جگمگی
کہ تھی چاندنی جس کے قدموں لگی

نہ پھولے سماتے تھے تکیے دھرے
کہ تھے وے فقط حُسن ہی سے بھرے

بلوریں صُراحی، وہ جامِ بلور
دل و دیدہ وقفِ تماشاے نور

زمیں نور کی، آسماں نور کا
جدھر دیکھو اودھر سماں نور کا

چمن سارے داؤدیوں سے بھرے
جوانانِ شُبّو کے ہر جا پرے

Scanned by CamScanner

ستاروں کا مہتاب میں حال یوں — کہ چونے میں پانی کے قطرے ہوں جوں
اگر کیجیے سایے اوپر نگاہ — تو ہے وہ بھی جوں سایۂ مہرو ماہ
کرے ہے نگہ جس طرف کو گزر — بہ جُز نور، آتا نہیں کچھ نظر
کرے کون سے حُسن کو اِنتخاب — ہر اک آئنے میں وہی ماہتاب
نظر جس طرف جائے نزدیک و دور — اسی ایک مہ کا ہے ہر جا ظُہور
نکل اپنی وحدت سے، کثرت میں آ — وہی نور ہے جلوہ گر جا بہ جا
نئے رنگ سے ہر طرف ماہتاب — وہی ایک نکتہ کہ جس کی کتاب
حقیقت کی لیکن بَصارت بھی ہو — کہ دیکھے نہ اُس کے سوا غیر کو

13.3.5 اقتباس کی توضیح وتشریح:

سحرالبیان اردو کی سب سے مقبول مثنوی ہے۔ اس کی مقبولیت کے کئی اسباب ہیں ، جن میں میر حسؔن کی زبان کی خاصی اہمیت ہے۔ مثنوی کو پڑھتے ہوئے سب سے پہلے جو چیز ہمیں اپنی گرفت میں لیتی ہے ،وہ اس کی زبان کا فطری بہاؤ ہے۔ اس قدر رواں اور عام زبان میں اتنی خوبصورتی کے ساتھ اس کو نظم کیا گیا ہے کہ بس پڑھتے جایئے اور عش عش کرتے رہیے۔

سحرالبیان کی تقریباً ہر داستان کی طرح اس داستان کا بھی آغاز ساقی نامہ سے ہوتا ہے۔ میر حسؔن نے ساقی ناموں سے ایک خاص طرح کا کام لینے کی سعی کی ہے۔اول یہ کہ اسے تمہید کے طور پر برتا ہے اور انہیں تمہیدی اشعار سے داستان کے قصے کی طرف رجوع کیا ہے۔دوم یہ کہ اس سے ہمارے ذہن کو ایک آسودگی کا احساس ہوتا ہے کہ ایک حصہ مکمل ہوا اور دوسرا شروع ہوا چاہتا ہے،ساتھ ہی تجسس میں اضافہ بھی ہوتا ہے کیوں کہ انہیں ابتدائی اشعار سے ہی انہوں نے آنے والے ابتدائی واقعے کا عندیہ بھی دینے کی کوشش کی ہے اور جس میں وہ کامیاب بھی رہے ہیں۔ جیسا کہ مندرجہ بالا اقتباس میں ہم نے پڑھا کہ:

کدھر ہے تو اے ساقیِ شوخ رنگ! — کہ آیا ہوں میں بیٹھے بیٹھے بہ تنگ
پلا مجھ کو دارو کوئی تیز و تند — کہ ہوتا چلا ہے مرا ذِہن کُند
مرے تَوسَنِ طَبع کو پَر لگا — مجھے یہاں سے لے چل فلک پر اُڑا
سُنو ایک دن کی یہ تم واردات — اٹھا سَیر کو بے نظیر ایک رات
ہوا نا گہاں اُس کا اک جا گُزر — سُہانا سا اک باغ آیا نظر

اس اقتباس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ شاعر بیٹھے بیٹھے تنگ آ گیا ہے اور اب اس کی طبیعت قدرے مختلف یعنی چستی پھرتی کی

Scanned by CamScanner

طرف مائل ہے تاکہ اس کا تخیل اسے، اس کے منشا کی طرف لے کر چل سکے۔ اس کے لیے وہ تلخ و کڑوی شراب کی آرزو ظاہر کر رہا ہے، جس سے کہ طبیعت میں حرکت پیدا ہو اور اس کا ذہن سست و کاہل ہونے سے بچ سکے۔ وہ سوچ رہا ہے کہ اسے ایسا تلخ جام مل جائے کہ اس کی طبع کے گھوڑے کو پر لگ جائیں جو اسے آسمان پر اڑا کر لے جائیں۔ اس کا مطلب قطعی یہ نہیں ہے کہ شاعر آسمان کی سیر کا آرزو مند ہے۔نہیں ہرگز نہیں وہ یہ نہیں چاہتا ہے۔ اس کی آرزو یہ ہے کہ اس کا تخیل دور کے مضامین لے آئے تاکہ اس کے نوکِ قلم سے ایسے اشعار رقم ہوں کہ جسے دیکھ کر زمانہ داد دینے پر مجبور ہو جائے۔ اپنی دلی خواہش کے اظہار کے بعد شاعر اصل مضمون کی طرف آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں ایک دن کی واردات آپ کو سناتا ہوں جب کہ بے نظیر ایک رات کو سیر کے واسطے اٹھا تو کیا کچھ ہوا۔ بے نظیر سیر کر ہی رہا تھا کہ اچانک اس کا گزر ایک ایسے مقام سے ہوا، جہاں اس کو ایک سہانا سا باغ نظر آ گیا۔وہاں اس باغ میں اس نے ایک سفید اور بلند عمارت دیکھی کہ جو نور میں چاندنی سے نہائی ہوئی تھی، جس کے سبب اس عمارت کا حسن دوبالا ہو گیا تھا۔

یہاں اگر یہ کہا جائے کہ مذکورہ اشعار سہلِ ممتنع کی مثال کے لیے پیش کیے جا سکتے ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔سہلِ ممتنع کی تعریف یہ ہے کہ اشعار میں کوئی مشکل لفظ نہ ہو یا جو بھی لفظ استعمال کیے گئے ہیں وہ سہل ہوں، ساتھ ہی یہ بھی کہ اس کی نثر بنانا مشکل ہو تو اسے سہلِ ممتنع کہتے ہیں۔ مذکورہ اشعار ہی نہیں بلکہ اس مثنوی کے زیادہ تر اشعار سہلِ ممتنع کی بہترین مثال کہے جا سکتے ہیں۔

اس کے بعد آئندہ اشعار میں انہوں نے جس طرح باغ کے مناظر کی منظر کشی کی ہے، وہ پڑھنے کی چیز ہے۔ میر حسنؔ کو فطرت کی منظر کشی پر بڑا کمال حاصل تھا، اسی لیے جہاں جہاں ایسے مواقع آئے ہیں، انہوں نے اپنی صلاحیت کا لوہا منوانے کی کوشش کی ہے۔ایسا موسم کہ جاڑے کی آمد آمد ہے، ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں۔ ہر طرف چاندنی چھٹکی ہوئی ہے۔موسم نہایت خوش گوار اور آسمان بالکل صاف ہے، جس سے چاند بالکل صاف دکھائی دے رہا ہے۔ صبح سے شام تک ایسا ہی پُر نور وقت لگا رہتا ہے ۔ایسا دلکش اور فرحت بخش موسم شہزادے کو بہت پسند آیا اور اس نے اپنے گھوڑے کو عمارت کی چھت پر اتار لیا۔ گھوڑے سے اتر کر تعظیم کے طور پر سر جھکایا اور آگے بڑھا۔ اس مکان کو تجسس بھری نظروں سے دیکھنے لگا کہ دیکھوں یہاں کوئی ہے یا نہیں؟ اس نے جب مکان کو دیکھا تو اسے کچھ ایسا نظارہ دکھائی دیا کہ اس کے بعد پھر اس کو اپنی خبر نہ رہی یا ہم اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ شہزادے کو اپنی سدھ بدھ نہ رہی۔ وہ اپنا سب کچھ بھول گیا اور اپنے جی میں سوچا کہ اب تو جو ہو سو ہو لیکن اب اس عمارت اور باغ کی سیر تو ضرور کروں گا۔ اپنے جی میں یہ کہہ کر وہ دبے پاؤں نیچے اترا، اس پر کسی کی نظر نہ پڑے، اس کا خیال کرتے ہوئے اس نے اپنے سائے تک کا خیال رکھا۔چپکے چپکے آگے بڑھا اور کسی طرح سب کی نظروں سے بچتے ہوئے وہاں کا دروازہ کھولا اور درختوں کے سائے کا سہارا لیتا ہوا آگے بڑھا۔ بے نظیر نے دیکھا کہ ایک طرف گنجان درخت ہیں جو آپس میں اس طرح لپٹے ہوئے ہیں کہ جیسے دو چاہنے والے آپس میں بغل گیر ہو رہے ہوں۔ایسی جگہ سے درختوں کے سائے کا سہارا لے کر وہ وہاں سے چھپ چھپ کر اس طرح نگاہ دوڑا رہا تھا جیسے درختوں کی اوٹ سے چاند نظر آ جائے۔اس باغ کا نظارہ دیکھا تو وہاں کا سماں اور چاندنی کچھ اور ہی خوبصورت دکھائی دیے۔ وہ سماں اور محل کچھ ایسے تھے کہ ان کو دیکھتے ہی اس کا دل بے اختیار ہو، اس کے قابو سے نکل چلا۔ ایسے میں جب اس کو اپنی جنس کی مہک آئی تو پھر اس کی

Scanned by CamScanner

حیرت کی انتہا نہ رہی اور وہ ادھر ادھر نگاہیں دوڑانے لگا۔

یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ شہزادہ بے نظیر پرستان سے آیا ہے، جہاں اس کو ایک پری نے قید کر رکھا ہے اور اسے تھوڑے سے وقت کے لیے ہی سیر کی اجازت دی ہے ، وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ تم نے کہیں اور کسی سے دل لگایا تو تمہارا حال وہی کروں گی جو کہ ایک مجرم کا ہوتا ہے۔ یہ تمام باتیں شہزادہ وہاں کا سماں ،دلکشی اور اپنی جنس کی مہک پاتے ہی بھول گیا ۔ ایسے میں جب اس کی نظر ایک نہایت حسین وجمیل دلربا پر پڑی تو اس کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔اس نے دیکھا کہ وہاں کی ہر چیز در و بام، طاق اور محراب بہت ہی صاف ستھرے ہیں تو اسے ایک صبحِ امید نظر آئی۔زمین پر تمامی یعنی ایک ریشمی کپڑے کا فرش بچھا ہوا ہے کہ جس کی جھلک فرش سے عرش تک پہنچ رہی ہے۔ زمین اور آسمان کا طبق اس طرح کا ہے کہ جیسے سنہرا ورق ہو۔ ہر طرف شیشے لگے ہوئے ہیں، جس سے فرش کا رنگ مزید روشن نظر آ رہا ہے۔ ایسے حسین اور دلفریب سماں میں جب اس کی نگاہ وہاں بیٹھی ہوئی رشکِ ماہ (یعنی وہ دوشیزہ کہ جس کو دیکھ کر چاند کو بھی رشک آئے)پر پڑی تو وہ دیکھتا رہ گیا۔اس کے حسن کا یہ عالم تھا کہ جیسے شیشے کی فانوس ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح قندیل چاروں طرف سے شیشے کے اندر روشن رہتی ہے ، اسی طرح وہ ماہ جبین بھی نظر آ رہی تھی۔اس سے پہلے کے اشعار میں شاعر نے وہاں کا جو منظر پیش کیا ہے ، اس سے چاروں طرف لگے شیشے کے باعث وہ حسینہ بھی بے نظیر کو فانوس کی مانند نظر آئی۔ اس شعر میں شاعر نے بدرِ منیر کی خوبصورتی کو پیش کرنے کے لیے تشبیہ کا استعمال کیا ہے۔ اس کی خوبصورتی کا یہ عالم ہے کہ اسے دیکھ کر عقل مند لوگ یہ کہیں گے کہ کسی نے پری کو شیشے میں بند کر دیا ہے۔ بدرِ منیر کی خوبصورتی کے بیان کے بعد شاعر نے وہاں کے منظر کا بڑی خوبی سے ذکر کیا ہے۔ یہاں میر حسؔن نے جزیات نگاری سے کام لیا ہے اور وہاں کی ایک ایک چیز کا ذکر بڑے والہانہ طریقے سے بیان کیا ہے۔ جہاں وہ آنکھوں کو خیرہ کرنے والی دوشیزہ بیٹھی ہے، وہاں کا عالم یہ ہے کہ اس کے حسن سے نور کا ازدہام دکھائی دے رہا ہے۔ چوں کہ وہاں ہر طرف قدِ آدم آئینے لگے ہوئے ہیں، اس لیے ان آئینوں میں پڑ کر اس کے حسن کا عالم مزید دوبالا ہو رہا ہے۔وہاں کے درخت اتنے لمبے ہیں کہ لگتا ہے آسمان کو چھو رہے ہیں۔ وہاں کی زمین و ہوا سب اپنے آپ فخر کر رہے ہیں۔وہاں ایک نہایت صاف و شفاف پانی سے لبریز نہر بہہ رہی تھی ، جس میں چاندنی کے پڑنے سے لہر پڑ رہی تھی۔

اس شعر میں ایک خاص صفت ہے اور وہ یہ کہ شاعؔر نے یہ نہیں کہا کہ لہروں پر چاندنی پڑنے سے اس کی خوبصورتی میں اضافہ ہو رہا تھا بلکہ اس نے یہ کہا ہے کہ چاندنی سے اس میں لہر پڑ رہی تھی۔یعنی اس شعر میں حسنِ تعلیل ہے۔حسنِ تعلیل کا مطلب ہے علت بیان کرنا یا وجہ بیان کرنا۔یہ شعر میں اس وقت قائم ہوتی ہے جب شاعر کسی فطری چیز کو کسی وجہ سے کچھ اور طرح سے پیش کرے اور جو موقع ومحل کے اعتبار سے مناسبت بھی رکھتی ہو۔ یہاں زیرِ بحث شعر میں شاعر کہتا ہے کہ'' پڑے چشمۂ ماہ سے جس میں لہر''۔ اس نے یہ نہیں کہا کہ پانی کی بہتی ہوئی لہروں پر چاندنی کا عکس پڑ رہا تھا جو دلکش نظر آ رہا تھا۔ اس کے بجائے وہ یہ کہتا ہے کہ چاندنی یا چشمۂ ماہ سے پانی میں لہریں پڑ رہی تھیں۔ یہاں ذرا سا سوچنے کی ضرورت ہے ، پانی کی لہروں کے مد و جزر پر جب چاندنی پڑتی ہے تو لہروں کا بہاؤ نظر آتا ہے، اسی لیے شاعر نے اس نزاکت کا خیال کرتے ہوئے اپنی بات مزید خوبصورتی سے ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔نہر کے پانی پر جب غور کیا تو دیکھا کہ وہ بالکل شیشے کی مانند صاف

Scanned by CamScanner

ستھرا ہے ۔ پانی کے جزر و مد سے اس میں جو فوارے چھوٹ رہے ہیں ،وہ چاندنی کے عکس کے باعث ہوا میں موتی سے رُلتے نظر آ رہے ہیں۔مقرض یعنی کٹا ہوا، مقیش یعنی ایک ایسا کپڑا جس میں سونے چاندی کے تار بٹے ہوئے ہوں۔ایسا کپڑے کا ٹکڑا، جب اس نہر کے پانی میں گرا تو محسوس ہوا کہ گویا رشک سے چاند ٹکڑے ہو کر گر پڑا ہے۔اس شعر سے شاعر وہاں کے منظر اور اس کی خوبصورتی کو بیان کرنا چاہ رہا ہے کہ وہ کس قدر دلکش تھا۔وہاں جو بھی لوگ چھوٹے بڑے موجود تھے، ان کی بھی خوبصورتی کا یہ عالم تھا کہ انہیں شاعر نے چاند کہا ہے اور یہ کہ ان کے ہاتھوں میں وہ مقیش ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے بہت سے چاند ستارے اُڑا رہے ہوں۔مطلب یہ کہ یہ لوگ اپنے ہنر سے تاروں کو توڑ کر زمین کو آسمان کا جوڑ بنا رہے تھے۔وہاں کا سماں اتنا دلکش تھا کہ ان کپڑوں کا ہوا میں چمکنا جگنو کی مانند محسوس ہو رہا تھا اور چاند کے حسن کو ماند کر رہے تھے۔صرف چاندنی میں اتنی خوبصورتی کہاں سے پیدا ہوسکتی ہے کہ جب تک اس میں کچھ طرے کی بات نہ ہو۔مقیش کے کپڑوں سے پورا ماحول زر فشاں یعنی سونے ہی سونے سا چمکتا نظر آ رہا تھا۔ایسے ماحول میں پھول، غنچے ، نسرین یعنی سارا چمن دلہن کی پیشانی کے مانند دمکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

یہاں میر حسؔن نے اپنی منظر نگاری کے خوب جوہر دکھائے ہیں۔انہوں نے یہاں جزیات نگاری سے کام لے کر ایک ایسا ماحول یا یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ ایک رومانی ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ جس میں کوئی بھی پہنچ کر اپنا دل ہار سکتا ہے۔ ایسے میں شہزادہ جو کہ پرستان سے بھاگنا چاہتا ہے اور انسانوں کے درمیان رہنا چاہتا ہے ، وہ جب پہنچے گا تو لازم ہے کہ اپنا سب کچھ ہار بیٹھے گا۔

وہاں موجود حسینائیں زری پوش تھیں ،جنہیں شاعر نے 'ماہ وش' یعنی چاند کی مانند کہا ہے جو سنہرے کپڑوں میں اتنی پرکشش لگ رہی تھیں کہ اُن کی خوبصورتی کو دیکھ کر سورج اور چاند کو غش آجائے، انسان کیا چیز ہے؟ وہاں ایک ایسا نمگیرہ، جس پر کہ سونے کا کام کیا ہوا تھا اور جس کی جھالر میں موتی جڑے ہوئے تھے ، وہ بھی نظر آ رہا تھا۔نمگیرے کو لگانے کے لیے جو چوبیں لگی ہوئی تھیں ، اُن سبھی میں ایک سلیقے سے تراشے ہوئے ہیرے جڑے ہوئے تھے۔انھیں دیکھ کر ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ سبھی ایک سانچے کے ڈھالے ہوئے ہیں۔نمگیرہ دراصل اس کپڑے کو کہتے ہیں جسے کھلے آسمان میں سوتے ہوئے شبنم سے بچنے کے لیے پلنگ کے اوپر لگا دیتے ہیں۔یہ بات آج کے دور میں مچھردانی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سمجھی جا سکتی ہے۔ کیوں کہ اس کو بھی لگانے کے لیے اسی طرح کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اِس مثال سے یہ بات اچھی طرح سمجھی جا سکتی ہے کہ اِسی طرح کا کچھ خاص انتظام اس عہد میں نمگیرے کو لگانے کے لیے کیے جاتا رہا ہوگا۔نمگیرے کو سنبھالنے کے لیے چاروں طرف جو رسّیاں لگی ہوئی تھیں، وہ بھی سونے کے تار کی بنی ہوئی تھیں اور ایسی نظر آ رہی تھیں کہ جیسے سونے کے ہار میں کناری لگی ہوئی ہو ۔ شاعر کہہ رہا ہے کہ اس جھالر کی خوبصورتی کا مَیں کیا ذکر کروں کہ وہ کیسی نظر آ رہی تھی؟ بس یوں سمجھیے کہ نمگیرے کے چاروں طرف وہ جھالر ویسی ہی نظر آ رہی تھی، جیسے کہ سورج کے اطراف کرنیں دکھائی دیتی ہیں۔ اُس جگہ سونے میں نہائی ہوئی ایک مسند یعنی پلنگ نظر آ رہا تھا، جسے دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ گویا چاندنی میں نہایا ہوا ہے۔

ابھی تک شاعر نے جن چیزوں کا ذکر کیا ہے ، ان کا تعلق اُن چیزوں سے تھا جو دور سے نظر آ رہی تھیں۔ یہاں یہ بات ذہن نشین

Scanned by CamScanner

رہے کہ جب ہم کسی نئی جگہ جاتے ہیں تو سب سے پہلے ہماری نظر تمام چیزوں پر سرسری پڑتی ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی چیز ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے تو پھر ہم اسے غور سے دیکھتے ہیں۔ یہی معاملہ یہاں بھی ہے۔شاعر نے سب سے پہلے اُن تمام چیزوں کا ذکر پہلے کیا جو بظاہر نظر آ رہی تھیں۔ یہاں یہ یاد رہے کہ شاعر باغ کی تمام چیزوں کا ذکر ضرور کر رہا لیکن اِن اشعار میں وہ جو کچھ بیان کر رہا ہے وہ بہ زبانِ شہزادہ کر رہا ہے یعنی شہزادے کی نگاہ جن جن چیزوں پر پڑتی ہے، شاعر ان کا ذکر کرتا جا رہا ہے اور جس طرح وہ ایک ایک چیز کو دیکھتا جا رہا ہے، اس کا بیان ہوتا جا رہا ہے۔

مذکورہ سطور میں جیسا بیان کیا گیا کہ شہزادے کی نگاہ جن جن چیزوں پر پڑتی ہے، ان کا ذکر نہایت خوبی سے میر حسؔن اپنی زبان میں بیان کرتے چلے جا رہے ہیں۔ پلنگ کے اوپر پڑا ہوا نمگیرہ، اس میں لگی رسیاں اور چوبوں کا ذکر ہو چکا اور اب اس کے اندرونی بناؤ کا ذکر آگے آ رہا ہے۔وہ پلنگ جس کی خوبصورتی کا ذکر بڑے ہی رچاؤ کے ساتھ درج بالا سطور میں آچکا ہے ۔اب اس کی اندرونی سجاوٹ کا ذکر آئندہ اشعار میں ہو رہا ہے ۔ اُس پلنگ پر جس کا کہ ذکر چل رہا ہے، رکھے ہوئے تکیے نہایت دلکش تھے اور ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ پھولے نہ سما رہے ہوں۔وہاں رکھی ہوئی شیشے کی صراحی اور جام بھی ایسے صاف و شفاف دکھائی دے رہے تھے کہ گویا نور میں نہائے ہوئے ہوں۔وہاں چہار جانب نور ہی نور کا سماں حتیٰ کہ زمین و آسمان بھی نور میں ڈوبے نظر آ رہے تھے۔ باغ میں موجود پھولوں کی کیاریاں گلِ داؤدی اور شبّو کے پھولوں سے کھلی ہوئی ہیں جو باغ کے حسن میں مزید چار چاند لگا رہی ہیں۔ستاروں کا چاند میں حال کچھ اس طرح کا تھا کہ گویا چونے میں پانی کے قطرے ہوں۔چونے میں پانی کے گرتے ہی چونے میں فوارے پھوٹنے لگتے ہیں، ویسا ہی کچھ منظر چاند میں ستاروں کا نظر آ رہا تھا۔ایسے عالم میں اگر سائے کے اوپر نگاہ کیجیے تو وہ بھی چاند سورج کے سائے کی طرح ہی ہیں یعنی نور کا عالم چاروں طرف ایسا ہے کہ سائے کا امکان ہی نہیں ہے۔ نگاہ جس طرف کو بھی اٹھتی ہے سوائے نور کے کچھ نظر نہیں آ رہا ہے یعنی حدِ نگاہ تک نور ہی نور کا عالم ہے۔ وہاں ماہتاب یعنی پری پیکر تو ایک ہی ہے لیکن چاروں طرف آئینوں کے ہونے سے یہ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کس کا انتخاب کیا جائے؟اسی ایک دوشیزہ کے ہر طرف جلوے ہیں خواہ نگاہ دور جائے یا نزدیک رہے۔وہاں پر وہی ایک نور ہر جگہ جلوہ گر ہے جو وہاں کی آرائش و زیبائش کی وجہ سے وحدت میں ہوتے ہوئے بھی کثرت میں نظر آ رہا ہے۔ یہ دوشیزہ جس کا ذکر یہاں شاعر کر رہا ہے، وہ ہر طرف ایک نئے رنگ میں نظر آ رہی ہے۔یہ بات پہلے آ چکی ہے کہ وہاں چاروں طرف آئینے لگے ہوئے ہیں، جن میں وہ ماہتاب نئے رنگ میں نظر آ رہا ہے ۔جس کے بارے میں شاعر کہہ رہا ہے کہ گویا وہ ایک نکتہ ہے، جس کی کتاب ہر سو نظر آ رہی ہے۔ایسی خوبصورت ، دلکش اور موہنی صورت کی اصلی صورت اگر نظر آ جائے تو پھر کسی دوسری کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہوگی۔اس لیے کہ اس قدر حسین و جمیل محبوبہ جس کسی کی بانہوں میں ہوگی وہ پھر دنیا کی طرف کیوں آنکھ اٹھا کر دیکھے گا۔

ابھی تک ہم نے جو پڑھا، اس کا تعلق باغ کی خوبصورتی محل اور وہاں کے پلنگ سے تھا۔ اب آگے کا بیان بدرِ منیر کی تعریف میں ہے یعنی وہ ملکۂ حسن جو ایسی خوبصورت دنیا میں رہتی ہے، اس کی خوبصورتی کا بیان مزید دلچسپ طریقے سے بیان کیا گیا ہے ۔ ظاہر ہے کہ اس میں بھی میر حسؔن نے اپنی طبیعت کی جولانی کے جوہر خوب دکھائے ہیں لیکن ہمارے مطالعے میں صرف مذکورہ

Scanned by CamScanner

اقتباس ہی ہے، اس لیے ہم اس کو یہیں ختم کرتے ہیں۔

15.4: آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی میں آپ

- میر حسن کے حالاتِ زندگی کے حالاتِ زندگی اور ذہنی تربیت سے واقف ہوئے۔
- میر حسن کی مثنوی سحر البیان کے اقتباس کے جملہ پہلوؤں کا تجزیاتی مطالعہ کیا۔
- میر حسن کی شاعری کی قدر و قیمت متعین کی۔
- میر حسن کے عہد کے ادبی و سیاسی منظر پر نظر ڈالی۔

15.5: اپنا امتحان خود لیجیے

1. میر حسن کے عہد کی نشان دہی کیجیے۔
2. میر حسن کی شاعری کی اہم خصوصیات بتائیے۔
3. میر حسن نے کن کن اصناف شعری میں طبع آزمائی کی۔
4. سحر البیان کی خصوصیات کیا ہیں۔

15.6: فرہنگ

ساقی	=	شراب یا پانی پلانے والا ،
زرتار	=	سونے کے تاروں سے بنائی ہوئی چیز
دارو	=	دوا، درماں، علاج، شراب
گنجان	=	گھنا
کند	=	غبی، ٹھس، ماند، سست
مشتاق	=	آرزو مند، شائق، خواہاں
تَوسَن	=	گھوڑا
جلوہ گر	=	جھلک، ظاہر ہونا، دکھائی دینا

Scanned by CamScanner

فلک = آسمان

خیرگی = حیرت، تیرگی، چکاچوند

وارِدات = واقعہ، سانحہ، حادثہ

یک لخت = تمام، فوراً، سر تا پا، بالکل

ناگہاں = اچانک، یکا یک

مغرّق = جگمگاتا ہوا، چمکتا ہوا، سونے چاندی میں لپٹا ہوا

دوچند = دوگنا

تمامی = ایک قسم کا ریشمی کپڑا

مہ = چاند

طبق = طبقہ، تختہ، درجہ

رُپہری = سنہری

بلور = شیشہ، نہایت صاف و شفاف

منور = روشن، چمکنے والا

فانوس = شمع دان، شمع کی چمنی جو اپنے اندر کی روشنی باہر ظاہر کرتی ہے۔ایک قسم کی بڑی قندیل

اِزدہام = بھیڑ، ہجوم

ملبّب = لبریز، بھرا ہوا، لبالب

چوپڑ کی نہر = وہ نہر جو + شکل کی ہو اور چاروں طرف گئی ہو

مقرّض = قینچی سے کترا ہوا

مقّیش = چاندی، سونے کے تاروں کا بنا ہوا کپڑا

طور = طرز، روش، ڈھنگ، طریقہ

طرّہ = پیشانی کے بال، زلف، کاکل

زر اَفشاں = اس کاغذیا کپڑے کو کہتے ہیں، جس پر سونے کے ورق ریزہ ریزہ کر کے چھڑکے ہوتے ہیں۔

تاجِ خروس = مرغ کا کیس، وہ سرخ گوشت کا ٹکڑا جو مرغ کے سر پر ہوتا ہے

جبینِ عروس = دلہن کی پیشانی

خراماں = ناز کی چال

زری پوش = زری کا لباس پہنے ہوئے

مہر و مہ = سورج اور چاند

Scanned by CamScanner

غش = بے ہوشی، بے ہوش ہو جانا

نمگیرہ = اوس سے بچنے کے لیے پلنگ کے اوپر ڈالا جانے والا کپڑا

زر نگار = جس پر سنہرا کام کیا گیا ہو

زرتار = سونے کے تاروں سے بنا ہوا

پھبن = آرائش، زیبائش، موزونی

صنعت = پیشہ، کاریگری

ماہتاب = چاند

بصارت = بینائی، نظر، شناخت

غیر = دوسرا، اجنبی، بیگانہ

سہلِ ممتنع = ایسا آسان اور سہل کہنا جس سے زیادہ آسان کہنا دشوار ہو

تشبیہ = ایک چیز کو دوسری چیز کے مانند ٹھہرانا

15.7: سوالوں کے جوابات

1۔ میر حسن کا عہد نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں کا زمانہ ہے جب دہلی تباہ ہوگئی تھی اور مغل حکومت کا چراغ گل ہونے والا تھا۔ نواب شجاع الدولہ نے دہلی کے شاعروں اور فنکاروں کو لکھنؤ کی دعوت دی تو میر حسن کے والد میر ضاحک کے ساتھ میر حسن بھی لکھنؤ منتقل ہوگئے۔ شجاع الدولہ کے بعد آصف الدولہ نے بھی اردو شعر و شاعری کی سرپرستی کی۔

2۔ میر حسن کی شاعری کی خصوصیات میں حسبِ ذیل باتیں شامل ہیں۔

1۔ جذبات کا سچا بیان اور مناظر قدرت کی سچی تصویر کشی

2۔ سادگی، روانی، فصاحت اور آمد کے علاوہ روز مرہ اور دہلی کے بامحاورہ زبان کا استعمال جو دبستان دہلی کے نمائندگی کرتی ہے۔

3۔ تشبیہ و استعارات میں ندرت

3۔ میر حسن نے غزلیں کہی ہیں۔ مثنویاں لکھی ہیں۔ اور مرثیہ بھی لکھے ہیں۔ وہ اپنی مثنوی ''سحر البیان'' کی وجہ سے مشہور ہیں۔

4۔ سحر البیان میں قدیم داستانوں سے استفادہ کیا ہے۔ یہ اپنے عہد کی تہذیبی و ثقافتی زندگی کو پیش کرتی ہے۔ اس میں جذبات نگاری اور مناظر قدرت کی سچی عکاسی ملتی ہے۔ اس میں مثنوی کے تمام اجزائے ترکیبی فنی مہارتوں کے ساتھ برتے گئے ہیں۔ جیتی جاگتی کردار نگاری مثنوی کا حسن ہے۔ یہ دبستانِ دہلی اسکول کی بھرپور نمائندگی کرتی ہے۔

Scanned by CamScanner

15.8: کتب برائے مطالعہ

1. مثنوی سحر البیان — رشید حسن خاں
2. اردو مثنوی شمالی ہند میں (جلد اول) — گیان چند جین
3. میر حسن، مثنویات میر حسن — عبد الباری آسی

Scanned by CamScanner

قصیدہ

عربی میں قصیدہ کا مطلب ہے: ''دل دار'' یا ''گاڑھا گودا'' کچھ علما کے نزدیک قصیدہ ''قصد'' سے بنا ہے کیونکہ شاعر ارادہ کر کے ایک خاص موضوع پر پوری توجہ کے ساتھ فکر شعر کرتا ہے، اس لیے اس صنف شعر کا نام قصیدہ قرار پایا۔ اُردو میں قصیدہ اُس صنف سخن کو کہتے ہیں جس میں کسی کی مدح یا مذمّت کی جائے۔ لیکن کبھی کبھی قصیدوں میں اور بھی مضمون باندھے گئے ہیں۔ اُردو میں عام طور پر قصیدے کو کسی مربّی یا بزرگ کی تعریف بیان کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

غزل کی طرح قصیدے کا پہلا شعر ہم قافیہ ہوتا ہے جو مطلع کہلاتا ہے۔ باقی اشعار کے دوسرے مصرعے، مطلع کی مناسبت سے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی قصیدے میں ایک سے زیادہ مطلع بھی ہوتے ہیں۔ غزل کے برعکس یہ زائد مطلع عموماً اشعار کے بیچ میں آتے ہیں۔ قصیدے میں اشعار کی تعداد مقرر نہیں۔ غزل کی طرح قصیدہ بھی ہر بحر میں لکھا جا سکتا ہے۔ قصیدے کے بارے میں عام خیال ہے کہ اس کی زبان پر شکوہ علمی اور بلند آہنگ ہوتی ہے۔

قصیدے کے درج ذیل اجزائے ترکیبی ہیں۔

1. **تشبیب:** اصل موضوع یعنی مدح یا مذمّت سے پہلے شاعر تمہید کے طور پر جو اشعار کہتا ہے، انھیں تشبیب کہا جاتا ہے۔ اس حصے میں بہار، شباب و شراب، حسن و عشق، فلسفہ و حکمت اور وعظ و نصیحت یا اسی قسم کے کسی اور موضوع سے متعلق مضامین نظم کیے جا سکتے ہیں۔
2. **گریز:** جب شاعر تمہید سے آگے بڑھ کر مدح کی طرف آتا ہے تو وہ تشبیب اور مدح میں تعلق یا ربط پیدا کرنے کے لیے ایک شعر یا چند اشعار کہتا ہے جن سے پہلے اور

© NCERT not to be republished

Scanned by CamScanner

تیسرے حصے کے درمیان کسی اجنبیت کا احساس باقی نہیں رہتا۔اُس ربط وتعلق پر مبنی اشعار کو اصطلاحاً ''گریز'' کہتے ہیں۔موڑ کا اصطلاحی نام ''گریز'' ہے۔

3. **مدح یا مذمّت:** یہ قصیدے کا اصل جز ہے۔ مدح میں عام طور پر ممدوح کے جاہ وجلال، عدل وانصاف، شجاعت وسخاوت اور علم وفضل وغیرہ کی تعریف، مبالغہ آمیز انداز میں کی جاتی ہے۔ساتھ ہی ممدوح کے ہاتھی، گھوڑے اور تلوار وغیرہ کی تعریف میں بھی اشعار کہے جاتے ہیں۔ مذمّت میں اس شخص کی ذات سے متعلق عیوب اور برائیاں بیان کی جاتی ہیں۔

4. **حسن طلب یا مدّعا:** قصیدے کے اختتامی حصے سے پہلے، شاعر کبھی کبھی ایسے اشعار بھی کہتا ہے جن کا مقصد ممدوح سے صلہ، بخشش اور اعزاز واکرام حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اس جز کو حسنِ طلب یا مدّعا کہتے ہیں۔

5. **دعا:** یہ قصیدے کا آخری جز ہوتا ہے۔ اس میں شاعر اپنے ممدوح کی صحت وسلامتی اور درازیِ عمر کے لیے دعا کرتا ہے۔

اُردو قصیدہ نگاری میں سوداؔ کا مقام سب سے بلند قرار دیا جاتا ہے۔ان کے بعد ذوقؔ، غالبؔ اور مومنؔ کے نام آتے ہیں۔ان کے بھی بعد کے لوگوں میں منیرؔ شکوہ آبادی، نسیمؔ دہلوی، محسنؔ کاکوروی اور امیرؔ مینائی مشہور قصیدہ گو ہیں۔ دکن میں نصرتیؔ اُردو کے عظیم ترین شاعروں اور قصیدہ نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

شامل کتاب قصیدہ مرزا غالب نے بہادر شاہ ظفر کی شان میں لکھا ہے۔

© NCERT not to be republished

Scanned by CamScanner

18.3 سودا کی قصیدہ نگاری

مرزا محمد سودا سے قبل دکن اور شمالی ہند میں ایسے اردو شاعروں کی تعداد خاصی ہے جنھوں نے قصیدے لکھے۔ ان تمام شاعروں اور خود سودا کے معاصرین کے قصیدوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی اردو زبان قصیدہ نگاری کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ سودا پہلے اردو شاعر ہیں جنھوں نے قصیدہ نگاری کے فن میں باقاعدگی پیدا کی اور اپنی غیر معمولی صلاحیتوں سے فن قصیدہ نگاری کو عروج پر پہنچایا۔ اس لیے بعض متاخر تذکرہ نگاروں نے انھیں فن قصیدہ نگاری کا 'نقاش اول' کہا ہے۔

سودا کے قصیدے سے اردو قصیدہ نگاری کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔ سودا کے قصیدوں میں مضامین کا تنوع، زور بیان کی قدرت، کلام اور پرشور انداز بیان ہے۔ قصیدے کا انداز بیان دوسری اصناف سخن سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ قصیدے میں شاعر طرح طرح کے موضوعات پر اظہار خیال کرتا ہے۔ اس میں مضمون آفرینی، جوش بیان، کلام کی پختگی، شکوہ الفاظ، روانی و سلاست، جدت بیان، قادر الکلامی اور مشکل زمینوں میں شعر کہنے کی قدرت شامل ہوتی ہے۔ ان تمام خوبیوں کے لیے شاعر میں غیر معمولی صلاحیتوں کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اسی لیے بیش تر تذکرہ نگاروں نے سودا کو فن قصیدہ نگاری کا امام کہا ہے۔ سودا کو بنیادی طور پر قصیدے کا شاعر تسلیم کیا جاتا تھا۔ حالاں کہ سودا کو غزل گوئی پر بھی پوری قدرت حاصل تھی اس لیے سودا کو پسند نہیں تھا کہ نقادان فن ان کے قصیدے کو غزل پر ترجیح دیں۔ ان کا ایک شعر ہے:

لوگ کہتے ہیں کہ سودا کا قصیدہ ہے خوب　　ان کی خدمت میں لیے میں یہ غزل جاؤں گا

سودا نے جب قصیدہ گوئی کے میدان میں قدم رکھا ہے اس زمانے میں دکنی اور اردو میں قصیدہ نگاری کی خاصی طویل روایت تو تھی لیکن ایسے قصیدے نہیں تھے جو سودا جیسے فن کار کے لیے قابل تقلید ہوتے۔ فارسی میں البتہ قصیدوں کا بیش بہا ذخیرہ موجود تھا۔ سودا نے ان ہی قصیدوں کو نہ صرف اپنے لیے نمونہ بنایا بلکہ اس فن میں خاطر خواہ اضافہ بھی کیا۔ قصیدے کی ابتدا عربی زبان میں ہوئی تھی۔ عربی میں جو قصائد کسی کی تعریف میں ہوتے تھے ان کی تمہید یعنی شروع میں عشقیہ اشعار ہوتے تھے جنھیں تشبیب کہا جاتا ہے۔ جب قصیدہ ایران آیا تو فارسی شاعروں نے عشقیہ مضامین کی پابندی نہیں رکھی بلکہ قصیدے کی تمہید میں طرح طرح کے مضامین داخل کر دیے۔ فارسی شاعروں نے مذہبی مسائل، پند و نصائح، صبر و قناعت، خودداری، انسانی عظمت، دنیا کی بے ثباتی و ناپائیداری، شاعرانہ تعلی یعنی اپنی اور اپنے فن کی تعریف، ہم عصروں پر طعن و تعریض اور معاشی بدحالی وغیرہ جیسے مضامین باندھے گئے۔ تشبیب کے بعد گریز ہوتا ہے۔ گریز ان اشعار کو کہتے ہیں جن کے ذریعے شاعر اپنے اصل موضوع کی طرف رجوع کرتا ہے۔ گریز کے بعد مدح شروع ہوتی ہے۔ گریز میں ایسے اشعار ہوتے ہیں جو تشبیب اور مدح میں ربط پیدا کرتے ہیں۔ مدح کے بعد خاتمہ ہوتا ہے جس میں شاعر ممدوح کے لیے دعا مانگتا ہے یا حسن طلب سے کام لے کر اپنے لیے کچھ طلب کرتا ہے۔

سودا نے جن بڑے فارسی قصیدہ نگاروں کی تقلید کی ہے اور ان کے قصیدوں کو اپنے لیے نمونہ بنایا ہے وہ ہیں خاقانی، انوری، عرفی۔ سودا نے سلاطین اور صاحب ثروت لوگوں اور بزرگان دین کی مدح میں کافی تعداد میں قصیدے کہے ہیں۔

بعض تذکرہ نگاروں نے رائے دی ہے کہ سودا کے قصائد فارسی شاعر عرفی، خاقانی اور انوری کے پہلو بہ پہلو ہیں اور بعض کا تو خیال ہے کہ سودا اپنے بعض قصیدوں میں فارسی قصیدہ گو شعرا سے بھی آگے نکل گئے ہیں۔ محمد حسین آزاد جیسے ممتاز نقاد اور فن کے پارکھ نے سودا کے قصیدوں کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ 'اول قصائد کا کہنا اور پھر اس دھوم دھام سے اعلیٰ درجہ فصاحت و بلاغت پر پہنچانا سودا کا کارنامہ ہے۔ وہ اس میدان میں فارسی کے نامور

Scanned by CamScanner

18.6 خلاصہ

سودا کے آباو اجداد بخارا سے ہندستان آ کر دہلی میں آباد ہو گئے۔ سودا کے والد مرزا شفیع تجارت پیشہ تھے۔ سودا 1707ء دہلی میں پیدا ہوئے۔ یہیں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ سودا کی ادبی زندگی کا آغاز فارسی میں شعر گوئی سے ہوا۔ وہ شاعری میں خان آرزو کے شاگرد ہو گئے اور آرزو کے مشورے سے انھوں نے اردو میں شعر کہنے شروع کیے۔ بہت جلد اردو کے ممتاز ترین شاعروں میں شمار ہونے لگے۔ دہلی پر نادر شاہ اور احمد شاہ کے حملوں کے بعد سودا ترک وطن کر کے فرخ آباد چلے گئے۔ وہاں سے پہلے فیض آباد اور پھر لکھنو پہنچے۔ لکھنو میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کی قبر زمین میں اس طرح دب گئی تھی کہ اس کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا تھا۔ کچھ عرصے بعد اہل لکھنو نے زمین کھود کر قبر باہر نکالی اور اس کے مرمت کرائی۔ سودا پہلے شجاع الدولہ کے دربار سے وابستہ تھے۔ ان کی وفات کے بعد شجاع الدولہ کے صاحبزادے آصف الدولہ کے دربار سے منسلک ہو گئے۔ دونوں کے عہد میں سودا کو دو سو روپے ماہوار وظیفہ ملتا تھا۔

سودا نے غزل، قصیدہ اور دوسری اصناف سخن میں طبع آزمائی کی لیکن جن شاعروں نے قصیدے کے فن میں باقاعدگی پیدا کی اور اپنی غیر معمولی صلاحیتوں سے فن قصیدہ نگاری کو عروج پر پہنچایا ان میں سودا کا نام سرِ فہرست ہے۔ سودا کے زمانے کے بعض تذکرہ نگاروں نے سودا کو فنِ قصیدہ کا 'نقاشِ اول' کہا ہے۔ سودا کے قصیدوں میں مضامین کا تنوع، رنگا رنگی، قدرتِ کلام اور پرشور انداز بیان ہوتا ہے۔ سودا کو زبان پر جو قدرت حاصل ہے، وہ ان کے معاصرین میں کسی اور شاعر کو حاصل نہیں ہو سکی۔

غزل گوئی کے میدان میں بھی سودا کسی سے کم نہیں تھے لیکن بہت سے تذکرہ نگاروں نے غزل گوئی کے مقابلے میں ان کی قصیدہ نگاری کو ترجیح دی ہے۔ سودا نے جن فارسی شاعروں کے قصیدوں کو اپنا نمونہ بنایا ہے ان کے نام ہیں خاقانی، انوری اور عرفی۔

بعض نقادوں کا خیال ہے کہ سودا کے قصیدے فارسی شاعروں کے قصیدوں کے ہم پلہ ہیں جب کہ بعض کا کہنا ہے کہ قصیدہ گوئی میں سودا نے فارسی کے مشہور قصیدہ نگاروں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

Scanned by CamScanner

فرمایا جب انھوں نے کہ اے مہربانِ من — ایسے ہزار گھوڑے کروں تم پہ میں نثار
لیکن کسی کے چڑھنے کے لائق نہیں یہ اسپ — یہ واقعہ ہے اس کو نہ جانو گے ' انکسار
صورت کا جس کا دیکھنا ہے گا گدھے کو ننگ — سیرت سے جس کے نت ہے سگِ خشمگیں کو عار
بد رنگ جیسے لید و بدبو ہے چوں پشاب — بدہیئت یہ کہ اصطبل اوجز کرے ہزار
حشری ہے اس قدر کہ بہ حشر اس کی پشت پر — دجال اپنے منھ کو سیہ کر کے ہو سوار
اتنا وہ سرنگوں ہے کہ سب اڑ گئے ہیں دانت — جبڑے پہ بس کہ ٹھوکروں کی نت پڑے ہے مار
کم رو ہے اس قدر کہ اگر اس کے نعل کا — لوہا گلا کے تیغ بنادے کبھو ' لوہار
ہے دل کو یہ یقین کہ وہ تیغ روزِ جنگ — رستم کے ہاتھ سے نہ چلے وقتِ کارزار

مانندِ اسپ خانہ ٔ شطرنج اپنے پاؤں
جز وستِ غیر کے نہیں چلتا ہے زینہار

اس ہجویہ قصیدے میں صرف طنز و مزاح اور ظرافت نہیں ہے بلکہ آخری دور کے مغلوں کی مالی بدحالی اور فوجی نظام کی کمزوری کی سچی تصویر ہے۔

Scanned by CamScanner

حکومت کی مالی بدحالی نے جس کی یہ حالت کر دی تھی۔ بظاہر سودا نے اس قصیدے میں طنز و مزاح سے کام لیا ہے لیکن حقیقت میں یہ مغل حکومت کے زوال کی دردناک تصویر ہے۔ قصیدہ تضحیک روزگار کی ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے

ہے چرخ جب سے ابلق ایام پر سوار
رکتا نہیں ہے دست عناں کا بہ یک قرار

جن کے طویلے بیچ کوئی دن کی بات ہے
ہرگز عراقی و عربی کا نہ تھا شمار

اب دیکھتا ہوں میں کہ زمانے کے ہاتھ سے
موچی سے کفش پا کو گٹھاتے ہیں وہ ادھار

ان تین شعروں میں سودا نے اپنے عہد کے صاحب اقتدار طبقے کی مختصر لفظوں میں مکمل بدحالی بیان کر دی ہے۔
اس کے بعد سودا اپنے ایک دوست کا ذکر ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

ہیں گے چنانچہ ایک ہمارے بھی مہرباں
پاوے سزا جو ان کا کوئی نام لے نہار

نوکر ہیں سو روپے کے دیانت کی راہ میں
گھوڑا رکھیں ہیں ایک' سو اتنا خراب و خوار

پھر اس سپاہی کے گھوڑے کی تصویر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

نہ دانہ و نہ کاہ نہ تیمار نہ سئیس
رکھتا ہو جیسے اسپ گلی طفل شیر خوار

ناطاقتی کا اس کے کہاں تک کروں بیاں
فاقوں کا اس کے اب میں کہاں تک کروں شمار

مانندِ نقش نعل زمیں سے بجز فنا
ہرگز نہ اٹھ سکے وہ اگر بیٹھے ایک بار

اس مرتبے کو بھوک سے پہنچا ہے اس کا حال
کرتا ہے راکب اس کا جو بازار میں گزار

قصاب پوچھتا ہے مجھے کب کروگے یاد
امیدوار ہم بھی ہیں کہتے ہیں یوں' چمار

دیکھے ہے جب وہ توبڑہ و تھان کی طرف
گھورے ہے اپنے سم سے کنویں' ناپیں مار ما۔

ہے اس قدر ضعیف کہ اڑ جائے باد سے
میخیں گر اس کے تھان کی ہوویں نہ استوار

نہ استخواں نہ گوشت نہ کچھ اس کے پیٹ میں
دھونکے ہے دم کو اپنے کہ جوں کھال کو لوہار

گھوڑا اتنا سن رسیدہ ہے کہ اس کی عمر بتانا مشکل ہے۔ سودا کہتے ہیں:

ہے پیر اس قدر کہ جو بتلائے اس کا سن
پہلے وہ لے کے ریگِ بیاباں کرے شمار

لیکن مجھے ز روئے تواریخ یاد ہے
شیطاں اسی پہ نکلا تھا جنت سے ہو سوار

اس ہجویہ قصیدے میں صرف طنز و مزاح اور ظرافت نہیں ہے بلکہ آخری دور کے مغلوں کی مالی بدحالی اور فوجی نظام کی کمزوری ایک عظیم الشان حکومت کے زوال کی سچی تصویر ہے۔

القصہ ایک دن مجھے کچھ کام تھا ضرور
آیا یہ دل میں جایئے گھوڑے پہ ہو سوار

رہتے تھے گھر کے پاس قضارا وہ آشنا
مشہور تھا جنھوں کنے وہ اسپ نابکار

خدمت میں ان کی میں نے کیا جا یہ التماس
گھوڑا مجھے سواری کو اپنا دو' مستعار

Scanned by CamScanner

شہزادوں کے ساتھ عنان در عنان ہی نہیں گئے بلکہ اکثر میدانوں میں آگے نکل گئے ہیں۔ ان کے کلام کا زور و شور انوری اور خاقانی کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے سوز و گداز مضمون میں عرفی و ظہوری کو شرماتا ہے۔

سودا نے تقریباً 31 قصیدے لکھے ہیں انھوں نے آنحضرت ﷺ، حضرت علیؑ، حضرت امام کاظمؑ، حضرت امام ضامنؑ، حضرت امام عسکریؑ، حضرت امام مہدیؑ، حضرت فاطمہؑ، حضرت امام زین العابدینؑ، حضرت امام حسینؑ، حضرت امام باقرؑ، حضرت امام جعفر صادقؑ اور حضرت امام تقیؑ کی مدح میں قصیدے لکھے ہیں۔ دو قصیدوں میں سودا نے مغل بادشاہوں عالم گیر ثانی اور شاہ عالم کی مدح کی ہے۔ ان کے علاوہ سودا نے غازی الدین خاں، اودھ کے دو نوابوں شجاع الدولہ، آصف الدولہ اور حکیم میر کاظم، سرفراز الدولہ، حسن رضا خاں، نواب سیف الدولہ، احمد علی خاں، بسنت خاں خواجہ سرا، نواب مہربان خاں رند اور نواب عماد الملک کی مدح میں قصیدے کہے ہیں۔ سودا کا ایک فارسی قصیدہ بھی ملتا ہے جو قصیدہ در تعریف مسجد نو کے عنوان سے لکھا گیا تھا۔

قصیدے کی ایک قسم وہ بھی ہے جس میں کسی شخص، چیز یا روایت کی ہجو کی جاتی ہے یعنی مذاق اڑایا جاتا ہے۔ ہجو نگار جب سماج میں ناہموار، بے آہنگ، بدصورت اور ناقص چیزیں دیکھتا ہے تو اس کی حسِ مزاح جاگ جاتی ہے، وہ اپنی تخلیقی قوتوں کو بروئے کار لا کر ان چیزوں کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ پڑھنے والے پر ان چیزوں میں چھپا تضاد، ناہمواری اور بے آہنگی اجاگر ہو جاتی ہے۔ سودا نے کچھ ہجویں تو ہجو کے انداز میں لکھی ہیں اور کچھ قصیدے کی طرز پر۔

سودا کی ہجویں اور ہجویہ قصائد کو کئی خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ بعض ہجویں ایسی ہیں جن میں سودا نے سماجی اور معاشرتی زندگی کی ناہمواری کا مضحکہ اڑایا ہے۔ ان کی ظریفانہ طبیعت اور شگفتہ مزاجی نے اپنے بعض مخالفوں کو بھی طنز و مزاح کا نشانہ بنایا ہے۔ اپنے ہم عصر شاعروں میں انھوں نے میر ضاحک، فاخر مکیں، قیام الدین قائم اور میر تقی میر کو بھی نہیں بخشا۔

سودا نے گھوڑے کی کئی ہجویں اور ہجویہ قصائد کہے ہیں۔ انھوں نے حضرت علیؓ کے گھوڑے کی تعریف میں زمین آسمان ایک کر دیا ہے اور سیف الدولہ کی گھوڑی کی مدح میں اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ فارسی شاعر انوری نے گھوڑے کی ہجو لکھی ہے اس کے انداز پر سودا نے بھی اردو میں 'در ہجو اسپ موسوم بہ تضحیک روزگار' کے عنوان سے ایک ہجویہ قصیدہ لکھا ہے جسے سودا کے قصیدوں میں بہت اہمیت حاصل ہے۔

اپنے معاصرین کے مقابلے میں سودا گہرا سماجی شعور رکھتے تھے اسی لیے عہد سودا کی سماجی، تہذیبی، اقتصادی اور تاریخی حقیقتوں کو سمجھنے کے لیے ان کے کلام اور خاص طور پر ان کے شہر آشوبوں اور ہجویہ قصیدوں کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

سودا کی ولادت 1707ء میں ہوئی تھی۔ اس وقت تک مغل حکومت کے زوال کے اثرات کچھ زیادہ نمایاں ہوئے تھے کیونکہ تقریباً دو صدیوں کی محنت سے حاصل کی ہوئی دولت، طاقت اور عزت و شوکت باقی تھی۔ مغل خزانے ابھی دولت سے بھرے ہوئے تھے لیکن سودا کے دیکھتے ہی دیکھتے یہ خزانے خالی ہو گئے۔ عظیم مغل بادشاہ، جن کا جاہ و جلال ہندوستان کی تاریخ میں ضرب المثل تھا، ان کے وارث بے کسی اور لاچاری کی مکمل تصویر بن چکے تھے۔ سودا نے ان بادشاہوں کی آنکھوں میں سلائیاں پھرتے ہوئے دیکھیں۔ جواہرات سے بنایا گیا سرمہ جن کے پیروں کی دھول سمجھا جاتا تھا۔ ناز و نعم میں پلے ہوئے شہزادے ایک ایک روٹی کو ترس رہے تھے۔ پھولوں میں چلنے والی شہزادیاں، جنھیں کبھی سورج کی کرن نے بھی نہیں دیکھا تھا، حملہ آوروں کے ہاتھوں بے آبرو ہو رہی تھیں۔ نادر شاہ، احمد شاہ ابدالی، روہیلوں، مرہٹوں، جاٹوں اور سکھوں کے ہاتھوں دلی بار بار اجڑ رہی تھی۔ ان حالات کا اثر براہ راست فوج پر پڑا۔ ایران، خراسان، ترکستان اور افغانستان سے آنے والے سپاہیوں کی بھرتی بند ہو چکی تھی۔ شاہی خزانے خالی ہونے کی وجہ سے رہی سہی فوج بھی بے بس اور لاچار ہو گئی تھی۔ مہینوں اور بعض اوقات برسوں تنخواہ نہ ملنے کی وجہ سے سپاہیوں کے ولولے، سرداروں کی بہادری اور دلیری مفلسی کی نذر ہو چکے تھے۔ بادشاہ اپنے افلاس کی وجہ سے سپاہیوں کو تنخواہیں دینے سے معذور تھا۔ احمد شاہ کے زمانے میں محلات شاہی کے ساز و سامان کی فہرست بنا کر دکان داروں کو دے دی گئی تھی تاکہ انھیں فروخت کر کے سپاہیوں کی تنخواہیں دی جا سکیں۔ مفلسی سے تنگ آ کر فوجی اپنے گھوڑے بیچ دیتے تھے۔ پیدل فوج کے پاس وردیاں نہیں رہی تھیں۔ جانوروں کو کھانے کو چارہ نہ ملتا تھا جس کی وجہ سے وہ مرنے لگے تھے۔ یہ تھے وہ حالات جن کی عکاسی سودا نے اپنے قصیدے 'در ہجو اسپ موسوم بہ تضحیک روزگار' میں کی ہے۔ یہ ہجویہ قصیدہ ایک گھوڑے اور ایک سپاہی کی ہجو نہیں بلکہ یہ علامت ہے اس فوجی نظام کی۔

Scanned by CamScanner

3.5 مثنوی کا فن

اصناف سخن میں مثنوی کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ صنف بیانیہ شاعری کی معراج سمجھی جاتی ہے۔اس کے لیے ربط و تسلسل بے حد ضروری ہے۔مثنوی میں واقعات کا ایک سلسلہ ہوتا ہے'اس لیے تسلسل کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ یہ ضروری سمجھا گیا کہ مثنوی کا ہر شعر دوسرے سے زنجیر کی کڑیوں کی طرح مربوط اور جڑا ہوا ہو۔اس میں کسی طرح کا جھول نہ ہو۔مثنوی میں پلاٹ کی تعمیر ایسی ہونی چاہیے کہ ایک واقعہ سے دوسرا واقعہ از خود نکل آئے۔جن ضمنی واقعات کی مدد سے قصہ آگے بڑھتا ہے ان میں بھی ایک منطقی ربط و تسلسل اور تناسب و توازن ہو۔واقعات کو پیش کرتے ہوئے جزئیات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

3.5.1 کردار نگاری

چونکہ قصہ افراد کی مدد سے آگے بڑھتا ہے اسی لیے مثنوی میں کردار نگاری کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔قصہ کی دلچسپی میں اضافہ کرداروں ہی سے ہوتا ہے۔مثنوی میں مختلف طبقے اور عمر کے لوگ ہوتے ہیں۔یہاں بادشاہ بھی ہیں'وزیر بھی'شہزادے'شہزادیاں بھی ہیں وزیرزادے اور وزیرزادیاں بھی ہیں۔

Scanned by CamScanner

آقا بھی نوکر بھی' بچے بھی جوان اور بوڑھے بھی' عالم بھی ہیں جاہل بھی' مختلف پیشوں کے لوگ بھی۔غرض ہر ایک کی طرز زندگی مختلف اور گفتگو کا ڈھنگ جدا ہوتا ہے۔ باکمال شاعر وہی ہے جو تمام کرداروں کو اس طرح پیش کرے کہ وہ خوبیوں اور خامیوں سمیت سامنے آئیں ان میں زندگی کی حرکت ہو وہ شاعر کے ہاتھوں کٹھ پتلی نہ بن جائیں زمانہ اور ماحول کا اثر ان پر ہو۔

3.5.2 جذبات نگاری

ایک مثنوی میں مختلف کردار ہوتے ہیں ہر ایک الگ الگ رول ہوتا ہے۔ ہر کردار کو اس کی فطرت کے مطابق ڈھالنا پڑتا ہے۔مختلف مواقع اور حالات کے اعتبار سے ہر ایک کے جذبات کی تصویر کشی کرنی پڑتی ہے۔

3.5.3 منظر نگاری

مناظر کی حقیقی تصویر کشی سے قصہ کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے یہ تصویر کشی جس قدر حقیقت سے قریب ہوگی اسی قدر اثر انگیز ہوگی۔منظر دربار کا ہو کہ باغ وراغ کا' صبح کا منظر ہو کہ شام کا' بہار کے موسم کا منظر ہو کہ خزاں کا' کوہسار کا ہو کہ آبشار کا' ان کی فطری تصویریں پیش کی جائیں تو ان کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ تصنع اور مبالغہ سے منظر نگاری کا حق ادا نہیں ہوتا۔

3.5.4 زبان و بیان

مثنوی میں طرز اظہار بڑی اہمیت رکھتا ہے۔موضوع کے اعتبار سے زبان کا استعمال ہونا چاہیے۔ بزم کے بیانات میں جہاں شیریں لب ولہجہ ضروری ہے وہیں رزم کے بیان میں پرشکوہ الفاظ اور بلند آہنگی کا ہونا ناگزیر ہے۔ پرتکلف طرز کے مقابلے میں سادہ و پرکار انداز بیان زیادہ اہمیت رکھتا

Scanned by CamScanner

لفظ مثنوی عربی زبان کا لفظ ہے یہ لفظ مثنیٰ سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی ''دو دو کیا گیا'' یا ''دو دو'' کے ہیں۔ اس کے ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور ہر شعر کا قافیہ بقیہ اشعار کے قافیے سے مختلف ہوتا ہے۔ مثنوی کے تمام اشعار ایک ہی بحر میں ہوتے ہیں۔ چونکہ ہر شعر کا قافیہ بقیہ اشعار کے قافیے سے مختلف ہوتا ہے اور ہر شعر میں دونوں مصرعے ہم قافیے ہوتے ہیں اس لیے اسے مثنوی کا نام دیا گیا۔

مثنوی کی ہئیت کو سمجھنے کے لیے مثنوی ''گلزار نسیم'' کے چند شعر پڑھیے۔

Scanned by CamScanner

پورب میں ایک تھا شہنشاہ
سلطان زین الملوک ' ذی جاہ
لشکر کش و تاجدار تھا وہ
دشمن کش و شہریار تھا وہ
خالق نے دیے تھے چار فرزند
دانا ' عاقل ' ذکی ' خرد مند
امید کے نقل نے دیا بار
خورشید حمل ہوا نمودار

پہلے شعر میں قافیے ہیں شہنشاہ و ذی جاہ' دوسرے شعر میں تاجدار و شہریار' تیسرے شعر میں فرزند و خردمند اور چوتھے شعر میں بار و نمودار۔

اس سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ مثنوی کے ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہیں اور ہر شعر کا قافیہ پچھلے شعر کے قافیے سے مختلف ہے۔ مثنوی میں ردیف کا بھی استعمال ہوتا ہے مگر بہت کم ہوتا ہے۔ دوسرے شعر میں ردیف کا استعمال ہوا ہے یعنی ''تھا وہ'' ردیف ہے' تاجدار اور شہریار قافیے ہیں۔

مثنوی کے اس نظام قافیہ سے ہٹ کر ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ مثنوی نگاروں نے حسب ذیل اجزا یا ارکان کو بھی مثنوی میں شامل کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ تمام مثنوی نگاروں نے ان کی سختی سے پابندی نہیں کی۔ البتہ کچھ نہ کچھ اجزا تمام مثنویوں میں مل جاتے ہیں۔ عام طور پر مثنویاں ان اجزا پر مشتمل ہوتی ہیں: حمد۔ نعت۔ منقبت۔ مناجات۔ مدح بادشاہ/امرا۔ تعریف سخن یا تعریف خامہ۔ سبب تالیف۔ اصل قصہ۔ اختتام۔

میر حسن کی مشہور مثنوی ''سحر البیان'' میں سب سے پہلے حمد ملتی ہے۔ حمد کے بعد نعت' منقبت' تعریف اصحاب پاک رضوان اللہ علیہم اجمعین' مناجات' تعریف سخن' مدح شاہ عالم بادشاہ غازی بہادر کی' مدح وزیر الممالک نواب آصف الدولہ بہادر کی' عجز و انکسار مصنف اور ''عرض کرنا داستان'' کے عنوانات کے تحت اشعار کہے گئے ہیں۔ پھر اصل قصہ شروع کیا گیا ہے۔ یہاں آپ کو یہ بتانا مقصود ہے کہ ہر شاعر مثنوی کا اصل قصہ شروع کرنے سے قبل مختلف عنوانات کے تحت اشعار کہتا ہے۔ انھیں مثنوی کے اجزا میں شمار کرنا چاہیے۔ ہر مثنوی میں کم و بیش یہ اجزا پائے جاتے ہیں۔

تعداد: مثنوی میں اشعار کی تعداد متعین نہیں ہوتی۔ چونکہ قصیدہ اور غزل کی طرح اس میں ایک ہی قافیہ کی پابندی نہیں ہوتی اس لیے شعرا نے طویل طویل مثنویاں لکھی ہیں۔ قلق کی مثنوی طلسم الفت میں چھ ہزار سے زائد اشعار موجود ہیں۔ ہاشمی کی مثنوی یوسف زلیخا میں 5142 اشعار ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

Scanned by CamScanner

10.3.1 انیس کی مرثیہ خوانی

لکھنؤ میں داستان گوئی، مثنوی خوانی اور مشاعروں کا رواج عام تھا۔ اس کے پڑھنے والے الفاظ کی ادائگی، آواز کے اتار چڑھاؤ اور اپنے حرکات وسکنات سے ایسا سماں باندھتے ہیں کہ مجمع مسحور ہو جاتا تھا اور یہ سلسلہ رات بھر جاری رہتا۔ مرثیے کا شمار بھی ان اصناف میں ہوتا ہے جس میں ڈرامائی عناصر کی کثرت ہے۔ ایک طویل مرثیہ پڑھنے کے لیے زبان و بیان کے ساتھ ساتھ حرکات و سکنات سے کام لینا بھی ضروری ہے۔ انیس اپنے دور کے سب سے مقبول مرثیہ خواں تھے جو مرثیہ گوئی کے ساتھ ساتھ مجمع کی نفسیات سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔

ان کی مرثیہ خوانی کے بارے میں بڑے بڑے شعرا اور ادبا اس بات میں ہم خیال ہیں کہ انہوں نے انیس جیسا ماہر فن مرثیہ خواں کبھی نہیں دیکھا۔ وہ لفظوں سے زمین، آسمان، صحرا، فرات، حملہ، دفاع وغیرہ کی ایسی تصویریں کھینچتے تھے کہ مجمع مسحور ومبہوت ہو جاتا تھا اور وہ ساری چیزیں اس کی نگاہوں کے سامنے تصویر بن کر کھڑی ہو جاتی تھیں۔ رزم خوانی پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ ایسا سماں باندھتے تھے کہ مجمع کھڑا ہو جاتا تھا۔

مرثیہ خواں کے لیے ضروری ہے کہ وہ مرثیہ خوانی میں آواز، لہجہ، ادائے الفاظ، چشم و ابرو کے اشارے اور آواز کے نشیب و فراز پر قابو رکھے اور انہیں برموقع برمحل استعمال کرے۔ میر انیس مرثیہ خوانی کے ان آداب سے خوب واقف تھے۔

10.3.2 وفات

19 شوال 1291ھ م 10 دسمبر 1874ء کو لکھنؤ میں ان کا انتقال ہوا۔ تقریباً ایک ماہ بیمار رہے۔ اپنے باغ واقع [illegible] محلہ میں دفن ہوئے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر قمری حساب سے 73 سال چند مہینے اور شمسی حساب سے 71 برس کی تھی۔ ان کی مجلس مرزا دبیر نے میر باقر کے امام باڑے میں پڑھی اور ایک بے مثل مسدس اور تاریخ وفات لکھی جس کا تیسرا شعر زبان زد ہر خاص و عام ہے

آسماں بے ماہِ کامل، سدرہ بے روح الامیں
طور سینا بے کلیم اللہ، منبر بے انیس

لوگوں نے انیس و دبیر کو لڑانے اور ان میں غلط فہمیاں پھیلانے کی بڑی کوشش کی لیکن پھر بھی ان دونوں کے دلوں میں میل نہیں آیا۔ بلکہ یہ دونوں صاحبانِ علم وفن ایک دوسرے کے مداح تھے۔ انیس کی جدائی میں دبیر بستر سے لگ گئے اور تقریباً تین ماہ بعد دبیر نے بھی انتقال کیا۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1 انیس کے خاندانی حالات بیان کیجیے
2 انیس کی علمی استطاعت کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
3 انیس کی مرثیہ خوانی پر اظہار خیال کیجیے۔
4 کس سنہ میں انیس کا انتقال ہوا؟ (1) 1874 (2) 1757 (3) 1857

10.4 انیس کی مرثیہ نگاری کی خصوصیات

انیس کے مرثیوں میں زبان و بیان کے حیرت انگیز تجربے ملتے ہیں۔ ان میں ان کی قادرالکلامی، فنی تبحر، انسانی نفسیات، اخلاقی اقدار، رزم کے ہنگامے، بزم کی رعنائیاں، کردار نگاری، منظر نگاری، جذبات نگاری، سراپا نگاری، تاریخ، تہذیب، فصاحت و بلاغت کا ہر نقش نظر آتا ہے۔ ان کے مرثیوں میں تقریر و خطابت کی جھلک بھی ہے، مجلس کے ماحول کی پابندیاں بھی ہیں اور سامعین کو تڑپانے والی کیفیت بھی ہے۔ انہوں نے صنائع بدائع سے بھی اپنے کلام کو سنوارا ہے۔ ان کے یہاں موقع و محل کے لحاظ سے مکالمے بھی ہیں اور الفاظ و تراکیب کا استعمال

Scanned by CamScanner

10.5.7 تجنیس ناقص وزائد

کلام میں ایسے الفاظ جس میں ایک حرف کم اور زائد ہو۔ انیس کہتے ہیں

پیاسی تھی جو سپاہ خدا تین رات کی　　　ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

10.5.8 حسن تعلیل

کسی بات کا اصل سبب بیان کرنے کے بجائے اس کی شاعرانہ توجیہ کرنا حسن تعلیل ہے۔ انیس کہتے ہیں

خواہاں تھے نخل گلشن زہرا جو آب کے　　　شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے

10.5.9 صنعت عکس وتبدیل

پانی میں آگ آگ میں پانی خدا کی شان

10.5.10 سیاقۃ الاعداد

کلام میں اعداد کا خوب صورت استعمال کرنا کلام میں حسن پیدا کرتا ہے۔

آواز شش جہت میں گیرو بزن کی تھی　　　اللہ کا کرم تھا مدد پنج تن کی تھی

10.5.11 تکرار

الفاظ کی تکرار سے بھی انیس نے کلام میں حسن پیدا کیا ہے مثلاً

حملہ کیا جو تیغ دو دم تول تول کے　　　ہتھیار سب نے پھینک دیے کھول کھول کے

10.5.12 تشبیہ

کسی چیز کو کسی دوسری بہتر چیز کے مماثل قرار دینا تشبیہ ہے۔ کلام انیس خوبصورت تشبیہات سے بھرا پڑا ہے مثلاً

کاٹھی سے اس طرح ہوئی وہ شعلہ خو جدا　　　جیسے کنار شوق سے ہو خوب رو جدا

10.5.13 استعارہ

مشبہ بہ کہہ کر مشبہ مراد لینا استعارہ ہے مثلاً

تھا شور کہ ہوش اڑتے ہیں یاں کبک دری کے　　　گھوڑے نہیں جھونکے ہیں نسیم سحری کے

ع　بلبل چہک رہا ہے ریاض رسول میں

ع　شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے

Scanned by CamScanner

تاب دی ۔ انیس کا دور 1803 تا 1872 پر محیط ہے اس عرصے میں انہوں نے غزل اور رباعیات بھی لکھیں لیکن انہیں دنیائے ادب میں باقی رکھنے والی صنف ان کی مرثیہ نگاری ہے ۔ انیس کے مرثیے ان کی فصاحت و بلاغت کے مظہر ہیں ۔ زبان ان کے گھر کی تھی ۔ سلاست میں خاندانی وراثت کے علاوہ انیس کی علمیت' شغف' مہارت اور خوش سلیقگی کا بڑا ہاتھ ہے ۔ سلاست و بلاغت کو زیب و زینت انہوں نے صنعتوں کے برمحل استعمال سے دی ہے ۔ ان کے مراثی میں مناظر و کیفیات کی تصویر کشی کے کئی مواقع آتے ہیں ۔ وہ بڑی مہارت سے ان کی مصوری کرتے چلے جاتے ہیں ۔ انہوں نے منظر نگاری' جذبات نگاری' کردار نگاری' مناظر رزم و بزم' مکالمہ نگاری' واقعہ نگاری اور سراپا نگاری میں کمال دکھایا ہے ۔ انیس کو فارسی' عربی زبان و ادب پر عبور حاصل تھا ۔ انہوں نے کئی علوم میں دستگاہ حاصل کی تھی ۔ مختلف علوم اور زبانوں پر تبحر کی وجہ سے ان کے اسلوب اور لسانی خصوصیات میں بڑی دلکشی محسوس ہوتی ہے ۔ ان کے مرثیوں میں روانی' سادگی اور سلاست ہے ۔ مرثیے انیس سے پہلے اور ان کے بعد بہت لکھے گئے لیکن انیس نے مرثیوں کو تنوع' تازگی اور نیا لب و لہجہ دیا ہے ۔

Scanned by CamScanner

''تعجب کی بات ہے جمیلن کی موت کی خبر پر میری آنکھوں سے ایک آنسو
نہیں۔ گرا۔ کیا ماہ پارہ کی وفات نہیں قتل۔ پر آنسوؤں کا سارا اسٹاک ختم
ہو گیا۔ میں روئی نہیں تو جیوں گی کیسے''۔[1]

رشک قمر کی زندگی ایسے اتار چڑھاؤ اور حادثات سے دوچار ہوتی ہے کہ اس کے احساسات منجمد ہو کر رہ جاتے ہیں۔ پھر وہی رشک قمر جو کبھی محفلوں کی جان ہوا کرتی تھی آخر کار ساری پر چکن کاڑھنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔

رشک قمر کے عبرت ناک انجام کے روپ میں قرۃ العین حیدر اس مردانہ سماج پر چوٹ کرتی ہیں جہاں مطلب کے نکلنے تک عورت کو پوجا جاتا ہے اور جیسے ہی وہ بیکار نظر آئی اسے در بدر بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ رشک قمر بہترین مغنیہ اور محبوبہ تو بن جاتی ہے لیکن کسی کی بیوی بن کر باعزت زندگی نہیں گزار پاتی ہے۔ اس میں بہت حد تک اس کے معاشی حالات اور مردانہ سماج کا رویہ ذمہ دار ہوتا ہے۔

☆☆

Scanned by CamScanner

على نفقات آبائهم، وقسم خارجي لمن يريد أن يرجع إلى أهله.

أنس: ما هي الأشياء التي تتوفر في القسم الداخلي؟

أستاذ: القسم الداخلي من المدرسة يحتوي على مسجد، وفصول للدراسة، وغرف النوم، ومكتبة ومطبخ، ودورات المياه، وقد تتوفر في بعض المدارس ملاعب للرياضة، ومن أمثال هذه المدارس المدرسة النورية التي أنشأها نور الدين الشهيد في دمشق، والجامع الأزهر الشريف الذي بناه جوهر الصقلي في القاهرة.

أنس: أوَ كان المدرسون في صدر الإسلام يأخذون الرواتب؟

أستاذ: لم يكن المدرسون في صدر الإسلام يأخذون أجرا على تعليمهم، حتى إذا تقدمت الحضارة وبنيت المدراس جعلت للمدرسين فيها رواتب شهرية، ولم يكن يجلس فيها للتدريس إلا من شهد له الشيوخ بالكفاءة، وكان للمدرسين ملابس خاصة بهم، والغربيون أخذوا من مدرسي الأندلس زيَّهم، فهو أصل الزي المعروف الآن في الجامعات الأوروبية.

أنس: هل هناك في التاريخ الإسلامي شخصيات بارزة قاموا بإنشاء المدارس؟

أستاذ: نعم، هناك عدد كثير لأولئك العظماء الذين لهم الفضل الأول في إنشاء المدارس في مختلف البلاد، منهم السلطان صلاح الدين الأيوبي، ونور الدين الشهيد، والشيخ عبد القادر الجيلاني، وفي القرون المتأخرة العلامة عبد العزيز المرادآبادي الملقب بحافظ الملة والدين.

أنس: ما هي أول المدارس الإسلامية وأشهرها؟

أستاذ: المدرسة النظامية ببغداد أولى المدارس وأهمها، درس فيها مشاهير العلماء فيما بين الخامس والتاسع الهجري، وقد بلغ عدد طلابها ستة آلاف طالب، كم كانت حضارتنا رائعة في بناء المعاهد ونشر العلم.

أنس: ما هي أشهر جامعة إسلامية في الهند؟

أستاذ: أشهر جامعة في الهند الجامعة الأشرفية مبارك فور، تخرج فيها عدد لا يحصون من العلماء والفضلاء الذين يقومون بخدمات جليلة في مختلف أنحاء العالم.

****

Scanned by CamScanner

ہو جاتے ہیں۔ اس کی لڑکی ماہ پارہ کیبرے ڈانسر بن جاتی ہے تو رشک قمر کو بہت دکھ ہوتا ہے۔ حالاں کہ وہ سوچتی ہے کہ خود اس نے اس کی ماں اور خالہ نے بھی یہی سب کیا جو ماہ پارہ نہایت اعلیٰ پیمانے پر بڑے اسٹائیل سے کر رہی ہے۔ پھر بھی ماہ پارہ سے پیسے لیتے ہوئے وہ کیوں جھجکتی ہے۔ وہ سوچتی ہے۔

''شاید اس لیے کے ہم لوگوں نے عزت اور ''وقار'' کا ایک پردہ اپنے سامنے آویزاں کر رکھا تھا گو وہ پردہ ٹاٹ کا تھا اوڑھنی دھوکے کی۔ وہ دھوکہ ہم اپنے آپ کو بھی دیتے تھے۔ اور دوسروں کو بھی اور وہ کیا انوکھی وفاداری تھی۔ حالاں کہ تمہیں معلوم ہے ایران میں ''خانگی'' طوائف ہی کو کہتے ہیں۔ اب ایک علی الاعلان ''ہائی کلاس پارٹی گرل'' کی کمائی کھاتے مجھے شرم آتی ہے۔ کس قدر غیر منطقی اور بے تکی بات ہے''۔[1]

قرۃ العین حیدر نے سماج کے اس دوغلے پن کو ان جملوں کے ذریعہ نمایاں کیا ہے جہاں ایک طرف تو شرافت کا ڈھونگ رچایا جاتا ہے۔ وہیں دوسری طرف اقتصادی مجبوریاں ایسے پیشے اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ رشک قمر بھی ایک ایسا ہی کردار ہے جو جمیلن کی طرح تو زندگی نہیں گزارتی ہے لیکن ایک مشرقی عورت اس کے اندر ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ اسی لیے جب وہ ماں کے روپ میں ہمارے سامنے آتی ہے تو مکمل مشرقیت کا نمونہ بن جاتی ہے۔ مطربہ و مغنیہ رشک قمر دو چار روپیوں کے میلا دپڑھ کر زندگی گزارتی ہے اور اپنی لڑکی کو بار ڈانسر بنتے دیکھ کر تڑپتی ہے لیکن ماہ پارہ اسی راستے پر چلتی ہے اور آخر کار مر جاتی ہے۔ اب رشک قمر واپس جمیلن کے پاس آجاتی ہے اور اسے پتہ چلتا ہے کہ جمیلن مر چکی ہے۔ اس کی موت کی خبر سن کر بھی رشک قمر نہیں روتی۔ قرۃ العین حیدر نے بڑے موثر انداز میں رشک قمر کے تاثرات بیان کیے ہیں۔ وہ سوچتی ہے:

Scanned by CamScanner

جمیلن ورما صاحب اور فرہاد جیسے بڑے لوگوں پر طنز کرتے ہوئے کہتی ہے:-

''کبھی آپ کے پاس وقت ہو تو ہمارے جمن خالہ سے ان کی داستانِ حیات بھی سنئے گا۔ یہ جو آپ لوگ اپنی کتابوں، رسالوں میں بڑی اونچی اونچی باتیں لکھتے ہیں سب بھول جائیں گے''۔[1]

جمیلن جسمانی طور پر معذور ہونے کے باوجود کسی سے مدد نہیں لیتی ہے۔ چکن کاڑھ کر اپنا خرچہ چلاتی اور اسی طرح زندگی گزارتے ہوئے دم توڑ دیتی ہے۔ جمیلن کے بارے میں فرہاد رشک قمر کے خط میں لکھتے ہیں:-

''تمہارے جانے کے بعد ہم نے جمیل النساء کو کئی بار امداد دینی چاہی لیکن اُنھوں نے ہمیشہ روپے واپس کر دیئے۔ اس قدر غیور لڑکی ہم نے آج تک نہیں دیکھی ساری عمر زندگی سے پھر موت سے لڑا کی''۔[2]

جمیلن ایک معذور لڑکی ہے لیکن پھر بھی خوددار ہے وہ صدف آرا اور رشک قمر کی طرح اس مردانہ سماج میں مردوں کے ہاتھوں کھلونا نہیں بنتی بلکہ اپنی نسوانیت کے وقار کو برقرار رکھتے ہوئے بنا مردوں کے سہارے محنت کر کے اپنی زندگی کاٹتی ہے۔ جب کہ رشک قمر جو اس ناولٹ کا مرکزی کردار ہے مردوں کے استحصال کا شکار ہوتی ہے۔ وہ کبھی فرہاد، کبھی ورما اور کبھی آغا شب آویز ہمدانی کی مہربانی حاصل کرتی ہے اور یہی لوگ اسے سہارا و پناہ دینے کے بجائے بے کس و تنہا کر دیتے ہیں۔ جہاں وہ در در بھٹکنے کے بعد قمرن سے رشک قمر تک کا سفر طے کرنے کے بعد واپس اسی جگہ پہنچتی ہے۔ جہاں وہ پہلے تھی۔ رشک قمر کو شب آویز ہمدانی کی رفاقت تو نہیں ملتی لیکن اس کے لاوارث بچے اس کا مقدر بن جاتے ہیں اور یہ بھی مردوں کے سماج میں وحشت و تباہی کی نذر

Scanned by CamScanner

وہی بھوکے گا''۔[1]

ورما صاحب ایک طرف تو خواتین کی حالت پر ہمدردی جتاتے دکھائی دیتے ہیں تو دوسری طرف انھیں اپنے ماتحت ہی دیکھنا چاہتے ہیں۔ اپنے احسانوں تلے رکھنا چاہتے ہیں۔ صدف کے منہ سے حقائق سن کر وہ اپنے مردانہ رعب کا استعمال کرتے ہیں۔ جبکہ صدف آرا اپنی حالت کا ذمہ دار تقدیر کو سمجھتی ہے۔

رشک قمر کی بہن جمیلن ایک حقیقت پسند خوددار لڑکی ہے۔ اس کے پیر میں لنگ ہے پھر بھی وہ رشک قمر اور صدف آرا کی طرح دوسروں کا سہارا نہیں لیتی لیکن زندگی کے متعلق اس کا اپنا الگ نظریہ ہے۔ اپنی جسمانی کمزوری پر وہ کڑھتی اور مایوسی کا شکار نہیں ہوتی بلکہ خدا کا شکر بجالاتی ہے کہ کم از کم وہ مکمل طور پر معذور تو نہیں ہے۔ ایک مرتبہ جب جمیلن اپنی کہانی ورما صاحب اور فرہاد کو سنانا چاہتی ہے تو رشک قمر اسے منع کرتی ہے کہ اسے ہمدردی وصول کرنے سے شرم آتی ہے تو جمیلن جواب دیتی ہے:۔

''ہمیں نہیں آتی شرم۔ جب قدرت کو ہماری یہ دھجا بنانے شرم نہ آئی تو ہمیں کیوں آئے''۔[2]

وہ ایک صاف گو اور خوددار لڑکی ہے لیکن معاشی حالت سے مجبور ہو کر ایک بار بچپن میں اپنی خالہ سے کہتی ہے:۔

''ہو جاؤ عیسائی۔ خدا نہ یہاں ہے نہ وہاں۔ فرق کیا پڑتا ہے۔ تمہارا اور میرا علاج تو ہو جائے گا۔ بجیا اسکول میں داخل ہو جائیں گی۔ ان کی زندگی بن جائے گی''۔[1]

Scanned by CamScanner

ہیں اور وہ خوش ہو جاتی ہیں''۔ا

مگر یہی ورما صاحب خود عورت کا استحصال کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ باتیں تو بڑی اونچی اونچی کرتے ہیں لیکن صدف آرا کو اس بات کا اندازہ رہتا ہے کہ ایک دن اس کا یہی حال ہونے والا ہے۔ ورما صاحب سے صدف آرا کی گفتگو سے ہم اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

اقتباس ملاحظہ ہو:۔

''ارے تم مرد لوگ ہو بڑے حرامی۔ ہم تو تب جانتے جب فرہاد صاحب ڈنکے کی چوٹ رشک قمر سے دو بول پڑھوا لیتے''۔

''زیادہ ٹر ٹر نہ کر''

''تم بھی ہمارے ساتھ وہی کرو گے ہمیں معلوم ہے جہاں تمہاری ماتا کہیں گی اس کنواری کنیا پتری راجکماری، سو بھاگیہ لکشمی کے ساتھ سات پھیرے ڈالو گے''۔

''دیکھو صدف ہمارا بھیجا مت کھاؤ جا کر سو رہو بھول گئیں تم کون تھیں۔ تمہیں کیا سے کیا بنا دیا...... اب اور زیادہ اونچے خواب نہ دیکھو بھائی۔ میلوں ٹھیلوں میں گانے والی موتی کو صدف آرا بیگم میں تبدیل کر دیا۔ پھر بھی چاؤں چاؤں''۔

''نام بدلنے سے قسمت تھوڑے بدل جاتی ہے جمیلن کا نام بدلنے سے کیا ان کی ریکھا بدل گئی۔ ویسے ہی پڑی پھنک رہی ہیں کھاٹ پر ہم جات کے ہندو۔ تم نے ہمیں بنایا صدف آرا بیگم۔ جمیلن کو کر دیا جل بالا لہری۔ اس سے کیا فرق پڑا۔ ارے جو بھگوان کے گھر سے لکھوا کر لایا ہے

Scanned by CamScanner

شادی کی بابت پوچھتا ہے تو وہ اسے تعجب سے دیکھتے ہوئے کہتی ہے:-

''بڑی بڑی خاندانی لڑکیاں آج کل ماں باپ کے ہاں بیٹھی سوکھ رہی ہیں ہم جیسوں سے بیاہ کوئی عقل کا اندھا ہی کرے گا۔ میاں آپ بھی کیا بھولی باتیں کرتے ہیں''۔[1]

رشک قمر کے ان جملوں سے قرۃ العین حیدر ہمیں سماج کے اہم مسئلہ کی طرف متوجہ کرواتی ہیں اور وہ ہے لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ۔

رشک قمر اپنی حیثیت سے خوش نہیں ہے لیکن اسی ماحول میں زندگی گزارتی ہے۔ ورما صاحب جب اس سے پوچھتے ہیں کہ عورتیں خانگیاں کیوں بن جاتی ہیں تو وہ چڑ کر جواب دیتی ہے:

''انسان پیٹ کی خاطر سب کچھ کرتا ہے۔ شرافت و رافت سب دھری رہ جاتی ہے۔ زیادہ تر خانگیاں سفید پوش بدحال گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں''۔[2]

قرۃ العین حیدر بھی عصمت چغتائی کی طرح عورتوں کی اقتصادی حالت پر سوال اُٹھاتی ہیں ان کا بھی یہی خیال ہے کہ اقتصادی پریشانیوں کی وجہ سے عورتیں وہی کام کرتی ہیں جن سے انھیں آمدنی زیادہ ملے۔ اس ناولٹ میں بھی رشک قمر ان ہی حالات کا شکار نظر آتی ہے۔ ورما صاحب ان کی داستان سن کر ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔

''تم لوگ تنہا نہیں ہو۔ ہمارے سماج میں زیادہ تر عورتوں کی زندگیاں ہمیشہ سے ٹریجک رہی ہیں اور انھیں مزید بیوقوف بنانے کے لئے انھیں ستی ساوتری، وفا کی پتلی، ایثار کی دیوی کے خطاب دے دیئے جاتے

Scanned by CamScanner

اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجو

قرۃ العین حیدر کے ناولٹ ''اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجو'' کا عنوان ہی اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ مردانہ سماج میں خواتین کی کیا حیثیت ہے۔ عنوان ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ مردوں کے مقابلے خواتین کی حالت قابل رحم ہے۔ اس ناولٹ میں رشک قمر کا کردار مردانہ سماج کے مختلف طور وار سہہ کر شکستگی کا اعتراف کرتا نظر آتا ہے۔ اس ناولٹ میں قرۃ العین حیدر نے عورت کے مقدر، اس کی مجبوری اور اس کے استحصال کو موضوع بنایا ہے۔ رشک قمر اپنی زندگی میں مختلف مراحل سے گزر کر تھک ہار کر واپس اسی درجے تک آجاتی ہے۔ مردوں کے استحصال کے نتیجے میں وہ امرتی سے رشک قمر اور پھر مطربہ اور مغنیہ بنتی ہے۔ کبھی فرہاد کبھی ورما صاحب اور کبھی آغا شب آویز ہمدانی کی پناہ چاہتی ہے۔ لیکن یہی ہمدانی اسے پناہ دینے کے بجائے بے کسی اور انتظار میں چھوڑ جاتا ہے اور اس کے لاوارث بچے رشک قمر کا مقدر بنتے ہیں۔

رشک قمر اور اس کی بہن جمیلن کا جنم بھی مردوں کے استحصال کا نتیجہ ہی ہے۔ وہ ناچ گا کر پیسے جمع کرتے ہیں اور اس طرح گزارا ہوتا ہے۔ بچپن ہی سے وہ یاسیت کا شکار رہتے ہیں۔ رشک قمر کو اپنی حیثیت کا اندازہ ہے۔ اسی لیے وہ شادی کے خواب بھی نہیں سجاتی لیکن جب فرہاد اس سے

Scanned by CamScanner

ایک بند اقتباس [illegible] ناقہ [illegible] ہوں میں

[illegible] سے جواب میں دشمنوں کی طرف سے تیروں کی بوچھار ہونے لگتی ہے۔ [illegible]

[illegible] کے لیے بھی استعمال [illegible] کی بارگاہوں سے واقف تھے۔ [illegible]

[illegible] ۱۸ [illegible]

کا کام ہوتا تھا۔ زبان و بیان کے اعتبار سے [illegible] یہ قول صحیح ہوتا ہے کہ مرثیے صرف رونے رلانے کے [illegible]

بازی ہے [illegible] اور شجاعت کے جذبات [illegible]

[illegible] یہاں تک کہ ہاتف کی آواز آتی ہے کہ جنت میں آپ کے استقبال [illegible] آپ نے گھوڑے کو روک لیا اور تلوار میان میں رکھ لی۔ [illegible]

منظر پیش کیا ہے۔

انیس نے صرف چھ بند [illegible] چار بندوں میں انیس نے امام حسین کی شہادت [illegible]

حسین کی شہادت کے بعد کوفہ و شام [illegible] حسین کی والدہ حضرت فاطمہ اور بہن حضرت زینب کی زبانی ہیں۔ یہ وہی بہن ہیں جنہوں نے امام [illegible] اثر اور دردناک تقریروں سے [illegible] کیا اور عوام کو یزید کے خلاف کھڑا کیا۔

10.8 ایک بند کی تشریح

یہ بند انیس کے مشہور مرثیے

ہے کس کی عیب

مقاماتِ وارد

نمک خوانِ تکلم ہے فصاحت میری

سے اخذ ہے جس کے متعلق یہ مشہور ہے کہ یہ مرثیہ انہوں نے اپنے بیٹے میر عسکری کو لکھ کر دیا تھا۔ بعد میں اپنے نام پر کر دیا۔ یہ بند فنِ کے بندوں سے متعلق ہے جس میں فصاحت کی خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ بند صنعت تضاد کی بہترین مثال ہے جس میں چار مصرعوں میں تضاد پیش کیا گیا ہے۔ فصاحت کے لیے وہ ایک ایک لفظ ہی نہیں ایک ایک نکتے کے صحیح استعمال کو فصاحت کا معیار بتاتے ہیں۔ مثلاً کجی کو ہر جگہ عیب سمجھا جاتا ہے خواہ وہ انسانی فطرت ہو، عمارت کی بنیاد ہو، تحریر کی سطریں ہوں یا کسی بھی حسن اور سلیقے کی بات ہو، کجی کو عیب ہی مانا جائے گا۔ لیکن یہی کجی ابرو کے لیے حسن کا کام کرتی ہے۔ اسی طرح سیاہی یا اندھیرے کو برا سمجھا جاتا ہے لیکن یہی سیاہی محبوب کی دراز زلفوں کے حسن میں اضافہ کرتی ہے۔ کاجل جسم کے کسی حصے میں لگایا جائے تو اس سے بدصورتی میں اضافہ ہوگا لیکن یہی کاجل اگر آنکھوں میں لگا جائے تو محبوب کی آنکھوں کا حسن کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔ اسی طرح جسم کے کسی بھی حصے پر تل ہونے سے وہ حسن نہیں پیدا ہوتا جیسا کہ محبوب کے چہرے کا تل اس کے رخسار کے حسن کو بڑھا دیتا ہے۔ یہ بند حقیقت نگاری کی بھی عمدہ مثال ہے۔ بیت فارسی میں ہے جس میں فصاحت کا معیار یہ پیش کیا گیا ہے کہ جس کا کلام فصاحت سے مملو ہے وہی اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ ہر بات موقع و محل کی مناسبت سے بھلی لگتی ہے اگر ایک نقطے کو بھی ادھر ادھر کر دیا جائے تو الفاظ بدل جانے سے معنی و مفہوم بدل جاتے ہیں۔ بیت کا یہ شعر اپنے آپ میں فصاحت کی مکمل تعریف ہے۔

10.9 خلاصہ

انیس جس زمانے میں مرثیے لکھ رہے تھے وہ اردو کی تاریخ میں کئی لحاظ سے اہم زمانہ تھا۔ اس وقت شمال میں اردو کے دو اہم مرکزوں لکھنؤ اور دہلی کا چرچا تھا۔ دہلی میں شاہ نصیر، ذوق، غالب اور مومن جیسے استاد دادِ سخن دے رہے تھے۔ لکھنؤ میں ناسخ، آتش اور ان کے شاگردوں کی غزل گوئی کے چرچے تھے۔ مثنوی قصیدے کی دھوم تھی۔ انیس نے اپنے ماحول میں مرثیے لکھ کر اردو شاعری کو تقدس کی آب و

ہے کجی عیب مگر حسن ہے ابرو کے لیے　　　تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لیے

شاعرانہ زبان کے باوجود اس حصے میں سادگی اور حسن ہے۔

چودھویں بند سے اصل مرثیہ شروع ہوتا ہے جس میں کربلا کے جاں نثاروں کا سراپا، فجر کی نماز کے وقت ماتم ہوا ہے جس میں اعزا اور گود کے پالے بچوں کے علاوہ ان اقربا اور انصار کا ذکر ہے جو رسول کے نواسے کا گھر آباد رکھنے کے لیے اپنا گھر لٹانے آئے تھے۔

یوں انیس ہم کہ نہ آل نہ اولاد رہے　　　گھر احمد کے نواسے کا گھر آباد رہے

دوسری طرف رفقائے امام حسین دعا مانگتے ہیں:

اٹھیں مقتل میں ہوں لاش شہ دلگیر کے ساتھ　　　سر ہو نیزوں پہ سر حضرت شبیرؑ کے ساتھ

دشمن کی للکار پر امام حسین متبسم ہوتے ہیں

ہنس کے منہ بھائی کا شاہ شہدا نے دیکھا　　　اپنے آقا کو بہ حسرت رفقا نے دیکھا

حضرت عباس غصے سے فرماتے ہیں:

رو سیاہوں کو بتا دیں کہ بڑھے آتے ہیں　　　ہم جو خاموش ہیں وہ منہ پہ چڑھے آتے ہیں

یہ شعر فصاحت کی بہت عمدہ مثال ہے۔

جنگ شروع ہوتی ہے، ایک کے بعد ایک سورما شہید ہوتا ہے۔ چند بندوں میں سارے اعزا و اقربا اور گود کے پالے بچے، صبح سے ظہر شہید ہو گئے۔ چونکہ مرثیہ امام حسین کی شہادت کے بیان میں ہے، اس لیے دوسرے ہیروؤں کی شہادت تفصیل سے نہیں پیش کی گئی ہے۔ حسین کو تنہا دیکھنے کے بعد دشمنوں نے انہیں جنگ کی دعوت دی۔

بڑھ کے چلاتے تھے بے درد کہ اب آپ آئیں　　　جوہر تیغ شہنشاہ نجف دکھلائیں

امام حسین رخصت آخر کے لیے خیمے میں تشریف لائے اور بہنوں کو آواز دی کہ میری شہادت کا وقت آ گیا ہے۔ بہنیں حواس باختہ ہو کر کھلے سر نکل آئیں، جو ان کی بدحواسی اور بے چینی کی علامت ہے کیونکہ ہندوستانی تہذیب میں عورتوں کا سر کھولنا اور ننگے پاؤں پھرنا معیوب ہے۔ رخصت کے سات بند ہیں جو درد و الم کا مرقع ہیں۔ امام حسین کو رخصت کرنے کے لیے اب صرف عورتیں خیمے میں رہ گئی تھیں، ایک بیمار بیٹا بے ہوش پڑا تھا جس کے لیے امام حسین خود فرماتے ہیں:

کہہ دو عابد سے کہ مرنے کو پدر جاتا ہے

بہنوں سے رخصت آخر لے کر اپنی معصوم بیٹی حضرت سکینہ سے رخصت ہوتے ہیں جو امام حسین کو میدان جنگ میں جانے سے روکتی ہیں

آؤ! اچھے مرے بابا، میں تمہاری واری　　　دیکھو تم بن ہیں گلے تک میرے آنسو جاری

آج یہ کیا ہے کہ بھولے میری خاطر داری　　　ہاتھ پھیلا کے کہو، آ میری بیٹی پیاری

منہ چھپانے کی ہے کیا وجہ نہ شرماؤ تم
اب میں پانی بھی نہ مانگوں گی چلے آؤ تم

میدان جنگ میں آمد کا صرف ایک بند ہے۔ اس کے بعد رجز کے دو بند ہیں۔

تھا یہ نعرہ کہ محمدؐ کا نواسہ ہوں میں

10.1 تمہید

اردو مرثیہ اپنی عظمت انسانی' اعلیٰ اخلاقی اقدار اور اس قربانی کی بدولت پہچانا جاتا ہے جس کی نظیر انسانی تاریخ' آج تک نہیں پیش کرسکی۔ ابتدا میں یہ واقعہ صرف تاریخ کا ایک سانحہ تھا لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا لوگوں کو اس واقعے کی عظمت اور اہمیت کا احساس ہونے لگا۔ خصوصاً اس لیے کہ یہ قربانی انسانیت کی فلاح اور اسلام کی بقا کے لیے دی گئی تھی۔ 'بنی امیہ' کے دور حکومت میں اس واقعے کو دبا دیا گیا تھا لیکن ایران میں ہر سال اس واقعے کی بازگشت سنائی دیتی رہی۔ دھیرے دھیرے اس واقعے کو تشیع ملی اور مشرق وسطیٰ کے ممالک میں پھیلنے لگا۔ واقعہ کی ہمہ گیری اور آفاقیت نے اسے ملک کی سرحدوں سے نکال کر پوری دنیا کے انسانوں میں امن کے پیغام کی حیثیت سے پہنچایا۔ تاکہ لوگ ظلم اور استبداد کے خلاف متحد ہوکر مقابلہ کریں اور سماجی برابری اور انسانی مساوات کو دنیا میں عام کریں۔

مرثیے کی ابتدا ذاتی' شخصی اور تاثراتی نظموں سے ہوئی' جس میں مرنے والے کے اوصاف بیان کیے جاتے تھے۔ لیکن آج مرثیے سے مراد وہ خاص واقعہ ہے جو ڈیڑھ ہزار سال پہلے عرب میں پیش آیا۔ عرب سے یہ شاعری ایران پہنچی تو صفوی بادشاہوں کے زمانے میں مرثیہ گوئی کا آغاز ہوا۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ مرثیے کا فن سب سے زیادہ اردو میں پھولا پھلا اور عزاداری کے رواج نے اس واقعہ کو تمام دنیا میں پھیلایا۔ تقریباً 100 سال سے کچھ زیادہ کا عرصہ 'مرثیے کا زرین دور ہے۔ لیکن انیس اور دبیر جیسا مرثیہ گو نہ تو ان سے قبل پیدا ہوا تھا اور نہ ان کے بعد کوئی مثال دی جاسکتی ہے۔ یہ انہیں کی محنت اور ریاضت کا نتیجہ ہے کہ مرثیے آج بھی مقبول ہیں۔

Scanned by CamScanner

وہ برق، وہ چمک اس کی، وہ صفائی اس کی کسی تلوار نے، تیزی نہیں پائی اس کی
اس کا بازو جو اڑایا تو کلائی اس کی مل گئی جس کے گلے سے اجل آئی اس کی
صورت مرگ، کسی نے بھی نہ آتے دیکھا
سر پہ چمکی، تو کمر سے اسے جاتے دیکھا

کبھی ڈھالوں پہ گری، اور کبھی تلواروں پر پیادوں پہ کبھی آئی، کبھی اسواروں پہ
کبھی ترکش پہ رکھا منہ، کبھی سوفاروں پہ کبھی سر کاٹ کے آ پہنچی، کماں داروں پہ
گر کے اس غول سے اٹھی، تو اس انبوہ میں تھی
کبھی دریا میں، کبھی بر میں، کبھی کوہ میں تھی

کبھی چہرہ، کبھی شانہ، کبھی پیکر کاٹا کبھی در آئی جگر میں تو کبھی سر کاٹا
کبھی مغفر، کبھی جوشن، کبھی بکتر کاٹا طول میں راکب و مرکب کو برابر کاٹا
برش تیغ کا غل، قاف سے تا قاف رہا
پی گئی خون ہزاروں کا، پہ منہ صاف رہا

نہ رکی خود پہ وہ، اور نہ سر پہ ٹھہری نہ کسی تیغ پہ دم بھر نہ سپر پہ ٹھہری
نہ جبیں پہ، نہ جگر پہ ٹھہری کاٹ کر زیں کو نہ گھوڑے کی کمر پہ ٹھہری
جان گھبرا کے، تن دشمن دیں سے نکلی
ہاتھ بھر ڈوب کے تلوار زمیں سے نکلی

کٹ گئی تیغ تلے جب صف دشمن آئی یک بیک فصل فراق سر و گردن آئی
بگڑی اس طرح لڑائی کہ نہ کچھ بن آئی تیغ کیا آئی کہ اڑتی ہوئی ناگن آئی
غل تھا، بھاگو! کہ یہ ہنگام ٹھہرنے کا نہیں
زہر اس کا جو چڑھے گا، تو اترنے کا نہیں

وہ چمک اس کی، سروں کا وہ برسنا ہر سو گھاٹ سے تیغ کے، اک حشر بپا تھا لب جو
آب میں صورت آتش تھی جلا دینے کی خو اور دم بڑھتا تھا، پیتی تھی جو اعدا کا لہو
کبھی جوشن، تو کبھی صدر کشادہ کاٹا
جب چلی، ضربت سابق سے زیادہ کاٹا

تن تنہا، شہ دیں، لاکھ سواروں سے لڑے بے سپر، برچھیوں والوں کی قطاروں سے لڑے
صورت شیر خدا، ظلم شعاروں سے لڑے دو سے اک لڑ نہیں سکتا، یہ ہزاروں سے لڑے
گر ہو غالب، تو ہزاروں پہ وہی غالب ہو
جو دل و جان علی ابن ابی طالب ہو

تیسرے فاقے میں یہ جنگ، یہ حملے یہ جدال پیاس وہ پیاس کہ نیلم تھے سراسر لب لال
دھوپ وہ دھوپ کہ سوکھے ہوئے تھے تازہ نہال لوں، وہ لوں جس کی حرارت سے پگھلتے تھے جبال
سنگ ریزوں میں، تب و تاب تھی انگاروں کی
سر پہ یا دھوپ تھی یا چھاؤں تھی تلواروں کی

کہ ... سے ... پیغام مرا بعد سلام
خوش تھے تم پھر گئے دروازے سے تک آئے امام
قبہ میں بجلی کے ... اے گل اندام
کانپہ صبر و رضا سے ... و شام
... میں ہے ... تمام جانو
... جاتا ہے ... جائے اب اور تم جانو

... کھینچی تیغ ادھر ... پہ آفت آئی
... بلا ... عرش ... قیامت آئی
تیغ تسلیم ... آداب کو نصرت آئی
فخر سے ... داری کو شوکت آئی
چوم لوں پاؤں جلال اس تک ... میں آیا
ہاتھ جوڑے ہوئے اقبال جلو میں آیا

آپ سیدھے جو ہوئے رخش نے بدلے تیور
دونوں آنکھیں ابل آئیں کہ ڈرے بالی شہر
توسن ... سے کیا دم کو بجور
مثل طاؤس اڑا، گاہ ادھر، گاہ ادھر
دم بہ دم گرد نسیم سحری پھرتی تھی
جھوم کر پھرتا تھا گھوڑا کہ پری پھرتی تھی

ابر ڈھالوں کا اٹھا، تیغ وہ پیکر چمکی
برق تڑپتی ہے، یہ چمکی تو برابر چمکی
سوئے پستی کبھی کوندی، کبھی سر پہ چمکی
کبھی انبوہ کے اندر، کبھی باہر چمکی
جس طرف آئی وہ ناگن، اسے ڈستے دیکھا
مینہ سروں کا، صف دشمن میں برستے دیکھا

دھار ایسی کہ رواں ہوتا ہے دھارا جیسے
گھاٹ وہ گھاٹ کہ دریا کا کنارا جیسے
چمک ایسی کہ حسینوں کا اشارا جیسے
روشنی وہ کہ گرے ٹوٹ کے تارا جیسے
کوندتا برق کا، شمشیر کی ضو میں دیکھا
کبھی ایسا نہیں دم خم مہ نو میں دیکھا

اک اشارے میں برابر کوئی دو تھا کوئی چار
نہ پیادہ کوئی بچتا تھا سلامت نہ سوار
برق گرتی تھی کہ چلتی تھی صفوں پر تلوار
غضب اللہ علیہم کے عیاں تھے آثار
موت ہر غول کو برباد کیے جاتی تھی
آگ گھیرے ہوئے دوزخ میں لیے جاتی تھی

تیغیں آری ہوئیں، ڈھالوں کے اڑے پرکالے
بند سب بھول گئے، خوف سے نیزوں والے
جو بڑھا ہاتھ بر دست، قلم کر ڈالے
تیغ کہتی تھی، یہ سب ہیں مرے دیکھے بھالے
صف پہ صف باندھ کے نیزوں کو عبث تولے ہیں
ایسے عقدے، مرے ناخن نے بہت کھولے ہیں

جب کبھی جائزۂ فوج ستم لیتی ہوں
موت سے رحم نہ کرنے کی قسم لیتی ہوں
دو زبانوں سے، سدا کار قلم لیتی ہوں
چہرے کٹ چکتے ہیں لشکر کے تو دم لیتی ہوں
ہر طرف ہو کے، عدم کے سفری ہوتے ہیں
طبلقیں کٹتی ہیں، چہرے نظری ہوتے ہیں

Scanned by CamScanner

تھا یہ نعرہ، کہ محمدؐ کا نواسا ہوں میں　　مجھ کو پہچانو! کہ خالق کا شناسا ہوں میں
زخمی ہونے سے، نہ مرنے سے ہراساں ہوں میں　　تیسرا دن ہے یہ گرمی میں کہ پیاسا ہوں میں
چین کیا چیز ہے، آرام کسے کہتے ہیں؟
اس پہ شکوہ نہیں کچھ، صبر اسے کہتے ہیں!

اس کا پیارا ہوں، جو ہے ساقیِ حوضِ کوثر　　اس کا بیٹا ہوں، جو ہے فاتحِ بابِ خیبر
اس کا فرزند ہوں، کہ جس نے مہم بدر کی سر　　اس کا دلبر ہوں میں، دی جس نے نبی کو دختر
صاحبِ تخت ہوئے، تیغ ملی، تاج ملا
دوشِ احمدؐ پہ، انھیں رتبۂ معراج ملا

بے وطن ہوں، نہ مسافر کو ستاؤ، للہ　　قتل کیوں کرتے ہو تم؟ کون سا میرا ہے گناہ؟
اب نہ یاور ہے کوئی ساتھ، نہ لشکر، نہ سپاہ　　تم کو لازم ہے، غریبوں پہ ترحم کی نگاہ
ہاتھ آئے گا نہ انعام، نہ زر پاؤ گے
یاد رکھو، مرا سر کاٹ کے پچھتاؤ گے

نہ ابھی ختم ہوئی تھی، یہ مسلسل تقریر　　حجت اللہ کے فرزند پہ، چلنے لگے تیر
چوم کر تیغ کے قبضے کو، پکارے شبیر　　او خبردار! چمکتی ہے علی کی شمشیر
پسرِ فاتحِ صفین و حنین آتا ہے
لو صفیں باندھ کے روکو تو! حسین آتا ہے

یہ صدا سن کے، حرم خیمے سے مضطر دوڑے　　شہ کی آواز پہ، سب بے کس و بے پر دوڑے
گر پڑیں سر سے ردائیں تو کھلے سر دوڑے　　بچے روتے ہوئے، ماؤں کے برابر دوڑے
رو کے چلائی سکینہ، شہِ والا آؤ!
میں تمھیں ڈھونڈتی تھی دیر سے، بابا آؤ!

آؤ اچھے مرے بابا! میں تمہارے واری　　دیکھو تم بن ہیں، کئے تک مرے آنسو جاری
آج یہ کیا ہے؟ کہ بھولے مری خاطرداری　　ہاتھ پھیلا کے کہو، آ مری بیٹی پیاری
منہ چھپانے کی ہے کیا وجہ؟ نہ شرماؤ تم!
اب میں پانی بھی نہ مانگوں گی، چلے آؤ تم

دیکھ کر پردے سے، یہ کہنے لگی زینب زار　　ابن زہرا! تری مظلومی کے ہمشیر نثار
آؤ! چادر سے کروں پاک میں چہرے کا غبار　　شہ نے فرمایا بہن! مر گئے سب مونس و یار
تم نے پالا تھا جسے ہم اسے رو آئے ہیں
علی اکبر سے جگر بند کو، کھو آئے ہیں

منہ دکھائیں کسے، سب سے ہے ندامت زینب!　　گھر میں آنے کی، نہیں بھائی کو فرصت زینب
کھینچ لائی ہے سکینہ کی محبت زینب!　　بھائی جاتا ہے، دکھادو ہمیں صورت زینب!
نہ تو سر کھولو، نہ منہ پیٹو، نہ فریاد کرو!
بھول جاؤ ہمیں، اللہ کو اب یاد کرو!

Scanned by CamScanner

دو پہر میں وہ چمن باد خزاں نے لوٹا
بچے بچے ہوا تاراج، تو بوٹا بوٹا
باپ بیٹے سے چھٹا، بھائی سے بھائی چھوٹا
ابن زہرا کی کمر جھک گئی، بازو ٹوٹا
پھر نہ یاور، نہ وہ جاں باز نہ وہ شیدا تھے
ظہر کے وقت حسین ابن علی تنہا تھے

صاحب فوج پہ طاری تھا عجب رنج و ملال
زرد تھا رنگ تو آنکھیں تھیں لہو رونے سے لال
کبھی بھائی کا الم تھا، کبھی بیٹے کا خیال
کبھی حمزہ کا تھا کہ لاشیں نہ کہیں ہوں پامال
کبھی بڑھتے تھے وغا کو کبھی رک جاتے تھے
سجدے ہوتے تھے کبھی اور کبھی جھک جاتے تھے

بڑھ کے چلاتے تھے بے درد کہ اب آپ آئیں
جوہر تیغ شہنشاہ نجف دکھلائیں
مرنے والے نہیں جیتے، جو بنائیں کھائیں
کاٹ لیں آپ کا سرتن سے تو فرصت پائیں
پسر سعد سے وعدہ ہے، صلا لینے کا
حکم ہے، خیمۂ اقدس کے جلا دینے کا

شہ نے فرمایا کہ سر کاٹ لو، حاضر ہوں میں
نہ تو لڑنے میں، نہ مرجانے میں، قاصر ہوں میں
فوج بھی اب نہیں، بے یاور و ناصر ہوں میں
شہر و صحرا بھی تمہارا ہے، مسافر ہوں میں
لوٹ لو، پھونک دو، تاراج کرو، بہتر ہے
کلمہ گویو! یہ تمہارے ہی نبی کا گھر ہے

کئی سیدانیاں خیمے میں ہیں پردے والی
جن کا رتبہ ہے زمانے میں ہر اک پہ عالی
اب نہ وارث ہے کوئی سر پہ، نہ کوئی والی
ان کو دیجو، کوئی رہ جائے جو خیمہ خالی
یہ نبی زادیاں، بے پردہ نہ ہوویں جس میں
ایک گوشہ ہو کہ سب بیٹھ کے روویں جس میں

شہ کی ان باتوں کا، اعدا نے دیا جو کہ جواب
گر لکھوں اس کو تو ہو جائے جگر سنگ کا آب
قلب تھرا گیا، ہرگز نہ رہی ضبط کی تاب
دیکھ کر رہ گئے گردوں کو شہِ عرش جناب
اشک خالی اُسے کہتے ہیں، جو دل بھر آئے
آپ رونے کے لیے خیمے کے در پر آئے

تھم کے چلائے، کہ اے زینب و اُم کلثوم
تم سے رخصت کو پھر آیا ہے، حسین مظلوم
اب سرِ قتل ہے، دم لب پہ ہے، یہ سب لشکرِ شوم
ہاں جگا دو اسے، غش میں ہے جو بیکس معصوم
نہیں ملتا جو زمانے سے گذر جاتا ہے
کہہ دو عابد سے، کہ مرنے کو پدر جاتا ہے

کہہ کے یہ باگ پھرائی طرف لشکر شام
پڑ گیا خیمۂ ناموس نبی میں کہرام
رن میں گھوڑے کو اڑاتے ہوئے آئے جو امام
رعب سے فوج کے دل ہل گئے کانپے اندام
سر جھکے ان کے، جو کامل تھے زباں دانی میں
اڑ گئے ہوش فصیحوں کے، رجز خوانی میں

Scanned by CamScanner

شہ نے فرمایا: مجھے خود ہے شہادت منظور
یہ لڑائی کی ہوس ہے نہ کرامت کا غرور
جنگ منظور نہ تھی ان سے، پر اب ہوں مجبور
تیر اعداء کے ستاتے ہیں یہ ہے ان کا قصور
ذبح کرنے کے لیے ظالم ناری آئے
کہیں جلدی، مرے سر دینے کی باری آئے

حکم پاتا تھا کہ شیروں نے اڑائے تازی
مثل شہباز گیا، ایک کے بعد اک غازی
واہ ری حرب! خوشا ضرب! زہے جاں بازی
اڑ گئے ہاتھ، بڑھا جو پئے دست اندازی
تن و سر لوٹتے ریتی پہ نظر آتے تھے
ایک حملے میں قدم فوج کے اٹھ جاتے تھے

جس پہ غصے میں گئے، صید پہ شہباز گرا
یہ کماں کٹ کے گری، وہ قدر انداز گرا
جب گرا خاک پہ گھوڑے سے، تو ممتاز گرا
نہ اٹھا پھر کبھی، جو تفرقہ پرداز گرا
ہاتھ منہ کٹ گئے، سر اڑ گئے، جی چھوٹ گئے
مورچے ہو گئے پامال، پرے ٹوٹ گئے

بعد غیروں کے، عزیزوں نے کیا عزم نبرد
سر کو نہوڑا کے، بھرا سبط نبی نے دم سرد
ہوک اٹھتی تھی کبھی سینے میں، دل میں کبھی درد
سرخ ہوتا تھا کبھی چاند سا چہرہ کبھی زرد
کوئی گل رو، تو کوئی سرو سہی بالا تھا
وہ بچھڑنے لگے، گودی میں جنہیں پالا تھا

زلفوں والا تھا کوئی، کوئی مرادوں والا
کوئی بھائی کا پسر کوئی بہن کا پالا
چاند سا منہ جو کسی کا تھا تو گیسو ہالا
کوئی قامت میں بہت کم، کوئی قد میں بالا
نوجواں، کون سا خوش رو، و خوش انداز نہ تھا
کتنے ایسے تھے کہ سبزہ ابھی آغاز نہ تھا

ہاتھ وہ بچوں کے اور چھوٹی سی وہ تلواریں
موم کر دیتی تھیں فولاد کو جن کی دھاریں
آب ہو شیر کا زہرہ، وہ اگر للکاریں
بجلیاں کوند رہی ہیں، کہ نیزے ماریں
کس بشاشت سے ہزاروں پہ دلیر آتے ہیں
بچے آتے ہیں، کہ بپھرے ہوئے شیر آتے ہیں

یہی ہنگامہ رہا صبح سے تا وقت زوال
لاش پر لاش گری، بھر گیا میدان قتال
مورچے سب تہ و بالا تھے، پرے سب پامال
سرخ رو، خلق سے اٹھے اسداللہ کے لال
کھیت ایسے بھی کسی جنگ میں کم پڑتے ہیں
جو لڑا، سب یہی سمجھے کہ علی لڑتے ہیں

قاسم و اکبر و عباس کا اللہ رے! جہاد
غل ہر اک ضرب پہ تھا، اب ہوئی دنیا برباد
الاماں کا تھا کہیں شور، کہیں تھی فریاد
دے گئے خلق میں مردانگی و حرب کی داد
گو وہ دنیا میں نہیں، عرش مقام ان کا ہے
آج تک عالم ایجاد میں، نام ان کا ہے

Scanned by CamScanner

اللہ اللہ! اسد حق کے نواسوں کا جلال
تیغ، کاندھے پہ رکھے ہوئے مانند ہلال
چاند سے چہروں پہ بل کھائے ہوئے زلفوں کے بال
گرچہ بچپن تھا، پہ رستم کو سمجھتے تھے وہ زال
صف سے گھوڑوں کو بڑھا کر جو پلٹ جاتے تھے
مورچے لشکر اعدا کے، الٹ جاتے تھے

آستینوں کو چڑھائے ہوئے، آمادۂ جنگ
سرخ چہرے تھے کہ شیروں کا یہی ہوتا ہے رنگ
وہی سارا اسداللہ کا نقشہ، وہی ڈھنگ
ولولہ صف کے الٹنے کا، لڑائی کی امنگ
جسم پر تیر چلیں، نیزۂ خوں خوار چلے
شوق اس کا تھا کہ جلدی کہیں تلوار چلے

یک بہ یک طبل بجا، فوج میں گرجے بادل
پھول ڈھالوں کے چمکنے لگے، تلواروں کے پھل
کوہ تھرائے، زمیں ہل گئی، گونجا جنگل
مرنے والوں کو نظر آنے لگی شکل اجل
واں کے چاؤش بڑھانے لگے دل لشکر کا
فوج اسلام میں، نعرہ ہوا یا حیدر! کا

شور میدانیوں میں تھا کہ دلیرو، نکلو!
نہر قابو میں ہے، اب پیاسوں کو گھیرو، نکلو!
نیزہ بازی کرو، رہواروں کو پھیرو، نکلو!
غازیو! صف سے بڑھو، غول سے شیرو! نکلو!
رستمو! داد وغا دو، کہ یہ دن داد کا ہے
سامنا حیدر کرار کی اولاد کا ہے

شور سادات میں تھا، یا شہ مرداں مددے!
قوت بازوے پیغمبر ذی شاں، مددے!
کعبۂ دیں مددے، قبلۂ ایماں مددے!
دم تائید ہے، اے فخر سلیماں مددے!
تیسرا فاقہ ہے، طاقت میں کمی ہے مولا!
طلب قوت ثابت قدمی ہے مولا!

پیاس میں حرف نہ شکوے کا زباں پر لائیں
دل نہ تڑپے، جو دم نزع نہ پانی پائیں
دم بہ دم سینوں پہ، فاقوں میں سنانیں کھائیں
تیرے فرزند کی تائید کریں، مرجائیں
لاشیں مقتل میں ہوں، اس شہ دلگیر کے ساتھ
سر ہوں نیزوں پہ، سر حضرت شبیر کے ساتھ

سامنے بڑھ کے، یکایک صف کفار آئی
روز روشن کے چھپانے کو، شب تار آئی
جھوم کر تیرہ گھٹا، تاروں پہ اک بار آئی
تشنہ کاموں کی طرف تیروں کی بوچھار آئی
ہنس کے، منہ بھائی کا شاہ شہدا نے دیکھا
اپنے آقا کو بہ حسرت، رفقا نے دیکھا

عرض عباس نے کی جوش ہے جراروں کو
میہمانوں کا نہیں پاس، ستم گاروں کو
تیر سب کھاتے ہیں، تولے ہوئے تلواروں کو
مصلحت ہو تو رضا دیجیے، غم خواروں کو
روسیاہوں کو بتا دیں، کہ بڑھے آتے ہیں
ہم جو خاموش ہیں، وہ منہ پہ چڑھے آتے ہیں

Scanned by CamScanner

جب فریضے کو ادا کر چکے، وہ خوش کردار
کس نے لہروں کو بصد شوق اٹھائے تھے پیار
جلوہ فرما ہوئے گھوڑے پہ شہ عرش وقار
علم نوح کو وہاں سے اٹھا لائے وہ
دشت میں نکہت فردوس بریں آنے لگی
عرش تک اس کے پھریرے کی ہوا جانے لگی

لہر وہ سبز پھریرے کی، وہ پنجے کی چمک
شرم سے ابر میں چھپ جاتا تھا خورشید فلک
کہتے تھے صل علیٰ چرخ پہ اٹھ کر کے ملک
دنگ تھے سب وہ تماشے جو سماں تھا یہ ملک
تھی یہ پستی اسے جو اوج زمانے دیکھا
وہ سماں پھر نہ کبھی ارض و سما نے دیکھا

اس طرح جب علم لہر زہرا جائے
کس سے پھر معرکۂ رزم میں ٹھہرا جائے
سانپ دشمن کو نہ کیوں چھاتی پہ لہرا جائے
لہر میں تا بہ فلک جس کا پھریرا جائے
رفع شر کو، علم خیر بشر آیا تھا
سورۂ نصر، پئے فتح و ظفر آیا تھا

وہ علم دار، کہ جو شیر الٰہی کا خلف
گوہر بحر وفا، فخر ادب، در نجف
فخر، حمزہ سے نمودار کا جعفر کا شرف
کس طرح چاند کہوں؟ چاند میں ہے عیب کلف
کس نے پایا وہ جو تھا جاہ و حشم ان کے لیے
یہ علم کے لیے تھے، اور علم ان کے لیے

سرو شرمائے قد اس طرح کا قامت ایسی
اسداللہ کی تصویر تھے، صورت ایسی
شیر، نعروں سے دہل جاتے تھے صولت ایسی
جا کے پانی نہ پیا نہر میں ہمت ایسی
جان جب تک تھی، اطاعت میں رہے بھائی کی
تھے علم دار، مگر بچوں کی سقائی کی

وہ بہشتی نے کیا جس کو وفا کہتے ہیں
سب انہیں عاشق شاہ شہدا کہتے ہیں
ان کو قبلہ تو انہیں قبلہ نما کہتے ہیں
جو بہادر ہیں وہ شمشیر خدا کہتے ہیں
عشق سردار و علم دار کا افسانہ ہے
وہ چراغ رہ دیں ہیں، تو یہ پروانہ ہے

اک طرف اکبر مہ رُو سا جوانِ نایاب
کچھ جو بچپن تھا، تو کچھ آمد ایام شباب
روشنی چہرے پہ ایسی کہ خجل ہو مہتاب
آنکھیں ایسی کہ رہا نرگس شہلا کو حجاب
جس نے ان گیسوؤں میں رخ کی ضیا کو دیکھا
شب معراج میں محبوب خدا کو دیکھا

اے خوشا! حسن رخ یوسفِ کنعانِ حسن
راحت روحِ حُسین، ابن علی، جانِ حسن
جسم میں زورِ علی، طبع میں احسان حسن
ہمہ تن خُلق حسن، حُسن حسن، شانِ حسن
تن پہ کرتی تھی نزاکت سے گرانی پوشاک
کیا بھلی لگتی تھی! بچپن میں شہانی پوشاک

[illegible] — دل کو لبھاتے تھے، سنبل کے وہ پرخم گیسو
[illegible] — قامت کی، یہ صدا سرو پہ تھی، کو، کو، کو
[illegible] کو تو عشق کا دم بھرتے تھے
اپنے معبود کی سب حمد و ثنا کرتے تھے

[illegible] وہ دہن — اس طرف طبل بجا، یاں ہوئی لشکر میں اذاں
وہ مصلی [illegible] قرآں — وہ نمازی، کہ جو ایماں کے تن پاک کی جاں
[illegible] ایسے تھے کہ ممتاز تھے، ابراروں میں
وہ ایسے تھے کہ [illegible]، تلواروں میں

کیا جوانان [illegible] تھے، سبحان اللہ — کیا رفیقان وفادار تھے، سبحان اللہ
صف [illegible] غازی و جرار تھے، سبحان اللہ — زاہد و عابد و ابرار تھے، سبحان اللہ
وطن و فرزند سے فرقت ہوئی، مسکن چھوڑا
پر محمد کے نواسے کا، نہ دامن چھوڑا

اللہ اللہ [illegible] عجب غازی تھے — عجب اسوار تھے بے مثل، عجب تازی تھے
لائق [illegible] سرافرازی تھے — گو بہت کم تھے، پہ آمادۂ جاں بازی تھے
پیاس ایسی تھی کہ آ آ گئی جاں ہونٹوں پر
صبر ایسے تھے کہ پھیری نہ زباں ہونٹوں پر

زہد میں حضرت سلماں کے برابر کوئی — دولت فقر و قناعت میں، ابو ذر کوئی
صدق گفتار میں، عمار کا ہمسر کوئی — حمزۂ عصر کوئی، مالک اشتر کوئی
ہوں گے ایسے ہی محمد کے جو شیدا ہوں گے
پھر جہاد ایسا نہ ہوگا، نہ وہ پیدا ہوں گے

گو مصیبت میں، تلاطم میں، تباہی میں رہے — سر کٹے، پانو مگر راہ الٰہی میں رہے
یوں سرافراز وہ سب لشکر شاہی میں رہے — جس طرح تیغ دو دم دست سپاہی میں رہے
اس مصیبت میں، نہ پایا کبھی شاکی ان کو
آبرو، ساقی کوثر نے عطا کی ان کو

وہ تخشع، وہ تضرع، وہ قیام اور وہ قعود — وہ تذلل، وہ دعائیں، وہ رکوع اور وہ سجود
[illegible] — یہ [illegible] اے رب ودود!
یوں نہیں ہم کہ نہ آل اور نہ اولاد رہے
پر احمدؐ کے نواسے کا گھر آباد رہے

موم فولاد ہو، آوازوں میں وہ سوز و گداز — اپنے معبود سے سجدوں میں عجب راز و نیاز
سر تو سجادوں پہ تھے، عرش معلیٰ پہ نماز — شیر دل، منتخب دہر، وحید و ممتاز
چاند شرمندہ ہو چہرے متجلی ایسے
نہ امام ایسا ہوا پھر، نہ مصلی ایسے

Scanned by CamScanner

وہ مرقع ہو کہ دیکھیں اسے گر اہلِ شعور
ہر ورق میں کہیں سایہ نظر آئے کہیں نور
گل ہو' یہ ہے کشش' جسم طرفہ نور
صاف ہر رنگ سے ہو قدرتِ صانع کا ظہور
کوئی ناظر ہو یہ نایاب تحریریں کھنچے
نقش اوراق پہ ہو کاوشِ لکیریں کھنچے

قلم فکر سے کھینچوں جو کسی بزم کا رنگ
شمع تصویر پہ گرنے لگیں آ آ کے پتنگ
صاف حیرت زدہ مانی ہو' تو بہزاد ہو دنگ
خوں برستا نظر آئے جو دکھاؤں صفِ جنگ
رزم ایسی ہو کہ دل سب کے پھڑک جائیں ابھی
بجلیاں تیغوں کی' آنکھوں میں چمک جائیں ابھی

روزمرہ شرفا کا ہو' سلاست ہو وہی
لب و لہجہ وہی سارا ہو' متانت ہو وہی
سامعین جلد سمجھ لیں جسے صنعت ہو وہی
یعنی موقع ہو جہاں جس کا عبارت ہو وہی
لفظ بھی چست ہو' مضمون بھی عالی ہووے
مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے

بے تکی مدح' مگر حسن ہے ابرو کے لیے
تیرگی بد ہے مگر زیب ہے گیسو کے لیے
سرمہ زیبا ہے' فقط نرگسِ جادو کے لیے
زیب ہے خال سیہ' چہرۂ گل رو کے لیے
داند آں کس کہ فصاحت بہ کلامے دارد
ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

بزم کا رنگ جدا' رزم کا میداں ہے جدا
یہ چمن اور ہے' زخموں کا گلستاں ہے جدا
فہم کامل ہو تو ہر نامے کا عنواں ہے جدا
مختصر پڑھ کے رلا دینے کا ساماں ہے جدا
دبدبہ بھی ہو مصائب بھی ہوں' توصیف بھی ہو
دل بھی محظوظ ہوں' رقت بھی ہو' تعریف بھی ہو

ماجرا صبحِ شہادت کا بیاں کرتا ہوں
رنج و اندوہ و مصیبت کا بیاں کرتا ہوں
تشنہ کاموں کی عبادت کا بیاں کرتا ہوں
جاں نثاروں کی اطاعت کا بیاں کرتا ہوں
جن کا ہمتا نہیں ایک ایک مصاحب ایسا
ایسے بندے نہ کبھی ہوں گے' نہ صاحب ایسا

صبح صادق کا ہوا چرخ پہ جس وقت ظہور
زمزمے کرنے لگے' یادِ الٰہی میں طیور
مثلِ خورشید' برآمد ہوئے خیمے سے حضور
یک بیک پھیل گیا چار طرف دشت میں نور
شش جہت میں رخِ مولا سے ظہورِ حق تھا
صبح کا ذکر ہے کیا! چاند کا چہرہ فق تھا

ٹھنڈی ٹھنڈی وہ ہوائیں' وہ بیاباں' وہ سحر
دم بہ دم جھومتے تھے' وجد کے عالم میں شجر
اوس نے فرشِ زمرد پہ بچھائے تھے گہر
لوٹی جاتی تھی لپکتے ہوئے سبزے پہ نظر
دشت سے جھوم کے جب بادِ صبا آتی تھی
صاف غنچوں کے چٹکنے کی صدا آتی تھی

10.6 مرثیۂ انیس

نمک خوان تکلم ہے فصاحت میری
ناطقے بند ہیں سن سن کے بلاغت میری
رنگ اڑتے ہیں وہ رنگین ہے عبارت میری
شور جس کا ہے وہ دریا ہے طبیعت میری
عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

ایک قطرے کو جو دوں بسط تو قلزم کردوں
بحر مواج فصاحت کو تلاطم کردوں
ماہ کو مہر کروں ' ذروں کو انجم کردوں
گنگ کو ماہر انداز تکلم کردوں
درد سر ہوتا ہے ' بے رنگ نہ فریاد کریں
بلبلیں مجھ سے گلستاں کا سبق یاد کریں

اس ثنا خواں کے بزرگوں میں ہیں کیا کیا مداح
جد اعلیٰ سا نہ ہوگا کوئی اعلا مداح
باپ مداح کا ' مداح ہے ' دادا مداح
عم ذی قدر ' ثنا خوانوں میں یکتا مداح
جو مناجات انہی سے ہوا ' نیک ہوا
نام بڑھتا گیا ' جب ایک کے بعد ایک ہوا

طبع ہر ایک کی موزوں ' قد زیبا موزوں
صورت سرو ' ازل سے ہیں سراپا موزوں
نثر بے نظم نہیں ' نظم معما موزوں
کہیں سکتہ نہیں آ سکتا ' کہا ناموزوں
تول لے عقل کی میزان میں ' جو سنجیدہ ہے
بات جو منہ سے نکلتی ہے ' وہ سنجیدہ ہے

خلق میں مثل خلیق اور تھا خوش گو کوئی کب؟
نام لے ' دھوئے زباں کوثر و تسنیم سے جب
بلبل گلشن زہرا و علی ' عاشق رب
قبع مرثیہ گوئی میں ہوئے ' جس کے سب
ہو اگر طبع میں جودت ہے کہ موزونی ہے
اس احاطے سے جو باہر ہے ' وہ بیرونی ہے

بھائی خوش فکرت و خوش لہجہ و پاکیزہ خصال
جن کا سینہ ' گہر علم سے ہے مالا مال
یہ فصاحت ' یہ بلاغت ' یہ سلاست ' یہ کمال
معجزہ گر نہ اسے کہیے ' تو ہے سحر حلال
اپنے موقع پہ جسے دیکھیے لاثانی ہے
لطف حضرت کا ہے ' یہ رحمت یزدانی ہے

کیوں نہ ہو! بندۂ موروثی مولا ہوں میں
قلزم رحمت معبود کا ' قطرہ ہوں میں
جس میں لاکھوں دُربہ جاں ہیں وہ دریا ہوں میں
مدح خوان پسر حضرت زہرا ہوں میں
وصف جوہر کا کروں ' یا صفت ذات کروں
اپنے رتبے پہ ' نہ کیوں آپ مباہات کروں؟

مبتدی ہوں ' مجھے توقیر عطا کر ' یا رب!
شوق مداحی شبیر عطا کر یارب!
سنگ ہو موم ' وہ تقریر ' عطا کر ' یا رب!
نظم میں رونے کی تاثیر ' عطا کر یارب!
جدو آبا کے سوا ' غیر کی تقلید نہ ہو
لفظ مغلق نہ ہو ' گنجلک نہ ہو ' تعقید نہ ہو

Scanned by CamScanner

[illegible] واقعہ [illegible] قریب [illegible]
[illegible] میں مبالغہ [illegible] بات [illegible] کلام کا حسن بن جاتا ہے [illegible] لیے ان کا مبالغہ کی حالت [illegible] معلوم ہوتا ہے۔ [illegible] کلام کی مرصع [illegible] ہے۔ انیس کے مزاج میں یہاں کا اعتدال [illegible]

ایک قطرے کو جو دوں بسط تو قلزم کر دوں
بحر مواج فصاحت کو تلاطم کر دوں
ماہ کو مہر کروں ذروں کو انجم کر دوں
گنگ کو ماہر انداز تکلم کر دوں
درد سر ہوتا ہے بے رنگ نہ فریاد کریں
بلبلیں مجھ سے گلستاں کا سبق یاد کریں

10.5.4 تعلی

اپنی اور اپنے کلام کی تعریف کرنا قدیم دور سے شعرا کا شیوہ رہا ہے۔ شاعر کو اپنا کلام سب سے عزیز ہوتا ہے۔ ہر بڑے چھوٹے شاعر نے تعلی سے بھرپور اشعار کہے ہیں۔ غالب کہتے ہیں

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

میر کہتے ہیں

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنیے گا
کہتے کسی کو سنیے گا تو دیر تلک سر دھنیے گا

انیس فرماتے ہیں

مرغان خوش الحان چمن بولیں کیا
جل جاتے ہیں سن کے روزمرہ مرا

انہوں نے تعلی کے بیشتر بند لکھے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ مبالغہ نہیں معلوم ہوتے۔ انہیں کلام پر ایسی ماہرانہ قدرت حاصل تھی کہ جہاں چاہتے تھے دریا کو کوزے میں سمیٹ دیتے تھے اور جب چاہتے تھے قطرے کو سمندر بنا دیتے تھے۔ طوالت کے خوف سے یہاں صرف ایک بند پیش کیا جاتا ہے۔

تعریف میں چشمے کو سمندر سے ملا دوں
قطرے کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں
ذرے کی چمک مہر منور سے ملا دوں
کانٹوں کو نزاکت میں گل تر سے ملا دوں
گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں

10.5.5 تضاد

کلام میں ایسے الفاظ لانا جو ایک دوسرے کی ضد ہوں۔ مثلاً رات اور دن، جھوٹا اور سچا، اچھا اور برا وغیرہ۔ انیس فرماتے ہیں:

کجی عیب مگر حسن ہے ابرو کے لیے
تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لیے

10.5 تنسیق الصفات

ممدوح کی صفات کا ذکر ترتیب وار کرنا۔ انیس کہتے ہیں:

ع خوش خو خوش خرام و خوش اندام و خوش لگام

Scanned by CamScanner

ع ہے خوبی میرا فصاحت فن مرا

ع بھولا ہوا فصاحت الفاظ کا چمن

فصاحت کے علاوہ بلاغت سے بھی میر انیس نے کام لیا ہے۔ فصاحت کی طرح اپنے کلام کی بلاغت پر بھی انہوں نے ناز کیا ہے۔

ع طے بند ہیں سن ان کے بلاغت مری

انیس نے خود دعا کی ہے:

وہ مرقع ہو کہ دیکھیں اسے گر اہل شعور
ہر ورق میں کہیں سایہ نظر آئے، کہیں نور
گل ہو، یہ ہے کشش موقلم طرز و نور
صاف ہر رنگ سے ہو قدرت صانع کا ظہور

کوئی ... تحریر ہو یہ نایاب تحریریں سمجھے
نقش ارژنگ کو ' کاواک لکیریں سمجھے

قلم فکر سے کھینچوں جو کسی بزم کا رنگ
شمع تصویر پہ گرنے لگیں آ آ کے پتنگ
صاف حیرت زدہ مانی ہو تو بہزاد ہو دنگ
خوں برستا نظر آئے جو دکھاؤں صف جنگ

رزم ایسی ہو کہ دل سب کے پھڑک جائیں ابھی
بجلیاں تیغوں کی آنکھوں میں چمک جائیں ابھی

روزمرہ شرفا کا ہو، سلاست ہو وہی
لب و لہجہ وہی سارا ہو، متانت ہو وہی
سامعیں جلد سمجھ لیں جسے، صنعت ہو وہی
یعنی موقع ہو جہاں جس کا، عبارت ہو وہی

لفظ بھی چست ہوں، مضمون بھی عالی ہووے
مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے

انیس کے دور کا لکھنؤ رعایت لفظی اور صنعتوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ صنعتوں کا اتنا زیادہ بوجھ کبھی کبھی کلام کے فطری حسن پر بار ہوتا ہے، کیوں کہ شاعر اردو کا شکار ہو جاتا ہے۔ انیس نے ان صنعتوں سے خوب فائدہ اٹھایا لیکن کلام کی روانی اور فصاحت کہیں متاثر نہیں ہوتی۔ کلام کے حسن میں اضافے کے لیے وہ کجی اور تیرگی سے بھی کام لینا جائز سمجھتے ہیں۔

ہے کجی عیب، مگر حسن ہے ابرو کے لیے
تیرگی بد ہے، مگر نیک ہے گیسو کے لیے
سرمہ زیبا ہے فقط نرگس جادو کے لیے
زیب ہے خال سیہ، چہرۂ گل رو کے لیے

10.5 ایہام

کلام میں ایسے ... انا جس کے معنی تو دو ہوتے ہیں مگر ان سے مراد صرف ایک معنی ہوتا ہے یعنی بعیدی معنی لیے جاتے ہیں۔ انیس
کلام میں ایہام ... نا پڑی ہیں مثلاً

... مہر کے پرتو سے نہ جائے
اقلیم سخن میری قلم رو سے نہ جائے
رنگ ... ہیں اور نمکیں ہے، عبارت میری
شور جس کا ہے وہ دریا ہے طبیعت میری

Scanned by CamScanner

10.5 اُسلوبی خصوصیات

زبان و بیان کے لحاظ سے اس مرثیے کا شمار انیس کے منتخب مرثیوں میں ہوتا ہے۔ اعلیٰ درجے کی شاعری کے جو شرائط ہیں وہ کلام انیس میں کسی بھی مقام پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ چیزوں کے سم' زبان پر قدرت اور اظہار کے اعلیٰ پیمانوں پر یہ مرثیے پورے اترتے ہیں۔ اگر ان میں سے ایک بھی پہلو کمزور ہو جائے تو قوت بیان میں کمی آ جاتی ہے۔ ان کی قادر الکلامی میں کوئی کلام نہیں۔ قادر الکلامی کا اعلیٰ منصب یہ ہے کہ شاعر سامعین کو اپنے قبضے میں کرلے اور وہ جذبات یا خیالات جو شاعر سامعین کے دل میں پیدا کرنا چاہتا ہے' مجمع اسے قبول کرلے۔ یہاں ان کی لسانی خصوصیات کا مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

10.5.1 فصاحت و بلاغت

فصاحت کے متعلق خود میر انیس کا خیال یہ ہے کہ

داند آں کس کہ فصاحت بے کلامے دارد
ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

انہوں نے خود پوری شاعری میں اس کی پابندی کی۔ وہ فصیح سے فصیح تر لفظ ڈھونڈ کرلاتے ہیں اور واقعہ کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ اس کا اثر کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔ واقعہ کربلا ایک ہی ہے اور شہدا کی شہادت کا بیان بھی ایک ہی ہے لیکن انیس اسی واقعہ کو ہر بار اس طرح پیش کرتے ہیں کہ وہ واقعہ نیا معلوم ہونے لگتا ہے۔ ڈیڑھ دو سو بند کے مراثی میں نہ خیال دہرائے جاتے ہیں نہ الفاظ۔

مرثیوں کی نوعیت عوامی اور مجلسی اہمیت کی ہوتی ہے۔ اہل مجلس کو متاثر کرنے' جذبات کو بیدار کرنے کے لیے مرثیوں کی بڑی اہمیت ہوتی ہے مگر میر انیس نے اسے ایک فن بنادیا۔ ایسا فن جس کی بلندیوں تک آج بھی کوئی نہ پہنچ سکا۔ میر انیس کو اپنی فصاحت کا خود بھی بڑا احساس تھا۔ اپنے مرثیوں میں جگہ جگہ انہوں نے اس کا ذکر کیا ہے۔

ع نمک خوانِ تکلم ہے فصاحت میری

Scanned by CamScanner

حضرت عون و محمد جو آٹھ نو برس کے بچے تھے ان کی جنگ کا بیان دیکھیے۔

وہ چھوٹے چھوٹے ہاتھ وہ گوری کلائیاں
آفت کی پھرتیاں تھیں غضب کی صفائیاں

ڈر ڈر کے کاٹتے تھے کماں کش کنائیاں
فوجوں میں تھیں نبیؐ و علیؑ کی دہائیاں

امام حسین دشمن کو للکارتے ہیں

اوا نیل کو اور برق شرر بار کو روکو
رہوار کو روکو، مری تلوار کو روکو!

....

پانی ہوئی ہر موج زرہ فوج کے تن میں
ملبوس میں زندہ تھے کہ مردے تھے کفن میں

اپنی معلومات کی جانچ

Scanned by CamScanner

لکھنؤ کے ادب و فنون نے جو ترقی کی ۔ وہ نہ اس سے پہلے کبھی کی تھی اور نہ بعد میں ہو سکی ۔ اصلاح زبان کی تحریک نے ادب کی تمام اصناف میں بہترین نمونے پیدا کیے ۔ داستانوں میں طلسم ہوش ربا اور فسانہ عجائب کے مقام و مرتبے سے روپوشی نہیں کی جا سکتی ۔ اردو کی تین بہترین مثنویاں سحر البیان' گلزار نسیم اور زہر عشق تقریباً ساٹھ برس کے عرصے میں اسی سرزمین پر لکھی گئیں ۔ آتش اور ناسخ نے اردو شاعری کو حسن زبان اور حسن خیال دونوں سے نوازا ۔ لیکن مرثیہ ان سب پر بازی مار لے گیا کیوں کہ اس کے ساتھ مذہبی عقائد اور ایک حقیقی واقعہ وابستہ تھا ۔

مرثیے کی مقبولیت کا ایک اور سبب یہ تھا کہ اودھ کی حکومت دھیرے دھیرے انگریزوں کے ہاتھ میں جا رہی تھی ۔ وہ آصف الدولہ کے دور سے ہی بہانے بنا کر دولت پر قبضہ جما رہے تھے ۔ انگریزوں کا دباؤ' مرکزی حکومت کی بیخ کنی' چھوٹی ریاستوں کا خاتمہ' جنگ آزادی کی جدوجہد' ایسے حالات تھے جن سے فرار کے دو ہی راستے تھے ۔ یا تو حالات زمانہ کو بھول کر بادہ و ساغر اور تفنن کے راستے تلاش کیے جائیں یا پھر وقت اور حالات سے لڑنے کے لیے روحانیت اور مذہب کے دامن میں پناہ لی جائے ۔ مرثیوں کے ہیرو جو خود انہیں حالات سے نبرد آزما تھے' ایسے حالات میں مثالی پیکر بن کر انہیں تقویت دیتے تھے اور یہ مرثیوں کی مقبولیت کا ایک بڑا سبب تھا ۔

Scanned by CamScanner

دو صاحب کر یا تھوں سے مدد [illegible] ملی جاتی　　[illegible] ہوتے [illegible] سے [illegible] جاتی
[illegible] اول [illegible] کی آواز آتی　　[illegible] یہ [illegible] ملی کی جاتی
[illegible] اوری [illegible] ایسا
[illegible] گوارا [illegible] دیکھا

رو کے چلاتی [illegible] مرے مظلوم حسین　　[illegible] اعدا [illegible] قتل کی ہے دھوم حسین
کچھ مجھے آنکھوں سے ہوتا نہیں معلوم حسین　　[illegible] کی [illegible] سے محروم حسین
[illegible] مصیبت [illegible] ہوں [illegible] جاتی
[illegible] اعدا [illegible] ہوں [illegible] جاتی

بس انیس آگے نہ لکھ زینبِ ناشاد کے بین　　قتل ہو جانے پہ بھی دھوپ میں تھی لاش حسین
قبر میں بھی نہ ملا [illegible] احمد مختار کو چین　　[illegible] آل رسول الثقلین
[illegible] شاہ کے مرجانے سے برباد ہوئے
لٹ گئے یوں کہ نہ [illegible] پھر آباد ہوئے

10.7 مرثیے کا تجزیہ

شامل نصاب مرثیہ امام حسینؑ کی شہادت کے بیان میں ہے۔ جس میں 101 بند ہیں اور اس کا مطلع ہے "نمک خوانِ تکلم ہے فصاحت مری"۔ مسعود حسین رضوی کا بیان ہے کہ یہ مرثیہ میر انیس نے اپنے صاحبزادے میر عسکری رئیس کو لکھ کر دیا تھا لیکن یہ راز کھل جانے پر انھوں نے کچھ مصرعوں میں ترمیم کر کے اپنے حسب حال بنالیا۔

مرثیے کے پہلے تمہید یا چہرہ پر انیس بہت دھیان دیتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک کامیابی کا پہلا زینہ تمہید ہے' تاکہ مجمع ان کی طرف متوجہ اور ہمہ تن گوش ہو اور مجلس جاگ جائے اس لیے چہرہ اور تمہید ان کے مراثی میں تنوع کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں اور انیس اپنے تخیل' زور بیاں اور زبان کا سارا ہنر صرف کر دیتے ہیں۔ پیش نظر مرثیے کا چہرہ تعلی پر مبنی ہے' جس میں شاعرانہ تعلی کے سات بند ہیں۔ جن میں اپنے کلام کی تعریف' زور بیان پر فخر' اپنے آبا و اجداد کے کارناموں کا فخریہ تذکرہ' اپنے باپ بھائی وغیرہ کے کلام کی تعریف ہے۔ یہ مرثیہ انیس کے اچھے مراثی میں شمار ہوتا ہے۔ پہلا بند رعایت لفظی کی اچھی مثال ہے۔

نمک خوانِ تکلف ہے فصاحت میری　　ناطقے بند ہیں سن سن کے بلاغت میری
رنگ اڑتے ہیں وہ رنگیں ہے عبارت میری　　شور جس کا ہے وہ دریا ہے طبیعت میری

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

تمہید کے بعد چھ بند دعائیہ ہیں جن میں اللہ سے مرثیہ گوئی کی توفیق و تائید کی دعا مانگی گئی ہے۔ اس حصے کے کئی بند زبان زد خاص ہیں مثلاً

وہ مرقع ہو کہ دیکھیں اسے گر اہل شعور　　ہر ورق میں کہیں سایہ نظر آئے کہیں نور
قلم فکر سے کھینچوں جو کسی بزم کا رنگ　　شمع تصویر پہ گرنے لگیں آ آ کے پتنگ

Scanned by CamScanner

کر کے میان میں مولا نے رکھی تیغ دو دم — ہاتھ اٹھا کر یہ اشارہ کیا گھوڑے سے کہ تھم
رہ گیا سر کو ہلا کے فرس تیز قدم — چار جانب سے مسافر پہ چلے اہل ستم
نیزے یوں گڑتے تھے جیسے گل تر خاروں میں
گھر گئے سبط نبی ظلم کی تلواروں میں

پہلے تیروں سے کمانداروں نے چھاتی چھانی — نیزے پہلو پہ لگاتے تھے ستم سے بانی
سر پہ تلواریں چلیں زخمی ہوئی پیشانی — خوں سے تر ہو گیا حضرت کا رخ نورانی
جسم سب چور تھا پرزے تھے زرہ جامے کے
پیچ کٹ کٹ کے کھلے جاتے تھے عمامے کے

برچھیاں مارتے تھے گھات پہ جو تھے پھرے — کس طرف جاتے کہاں تیغوں تلے سے ٹھہرے
اک ہزار اور کئی سو زخم تھے تن پہ بھرے — دیکھنے والوں کے ہو جاتے تھے پانی زہرے
خوں میں ڈوبا ہوا وہ مصحف رخ سارا تھا
جزو ہر اک تن شبیر کا سی پارا تھا

ہاتھ سے باگ جدا تھی تو رکابوں سے قدم — غش میں سجدے بھی ہوتے تھے فرس پر بھی خم
بہتے تھے پہلوؤں سے خوں کے دریا پیہم — کوئی بے کس کا مددگار نہ تھا ہائے ستم
مارے تلواروں کے مہلت نہ تھی دم لینے کی
کوششیں ہوتی تھیں کعبے کے گرا دینے کی

دشت سے آتی تھی زہرا کی صدا ہائے حسین! — مرے بے کس مرے بے بس مرے دکھ پائے حسین!
در سے چلاتی تھی زینب مرے ماں جائے حسین! — کون تیغوں سے بچا کر تجھے لے آئے حسین!
فاطمہ رو رہی ہیں ہاتھوں سے پہلو تھامے
حکم گر ہو تو بہن دوڑ کے بازو تھامے

ہائے! سید ترا تن اور ستم کے بھالے — کس کو چلاؤں کہ جیتے نہیں مرنے والے
اس پہ یہ ظلم دکھوں سے جسے زہرا پالے — کون سر سے ترے تلواروں کی آفت ٹالے؟
کون فریاد سنے بے سر و سامانوں کی؟
یاں تو بستی بھی نہیں کوئی مسلمانوں کی

نہ رہا جب کہ ٹھہرنے کا فرس پہ یارا — گر پڑا خاک پہ وہ عرش خدا کا تارا
غش سے کچھ دیر میں اٹھا جو علی کا پیارا — نیزہ سینے پہ سنان ابن انس نے مارا
واں تو نیزے کی انی پشت سے باہر نکلی
یاں بہن خیمے کی ڈیوڑھی سے کھلے سر نکلی

کھینچ کر سینے سے نیزہ جو بڑھا دشمن دیں — جھک کے حضرت نے رکھی خاک پہ سجدے میں زمیں
تیز کرتا ہوا خنجر کو بڑھا شمر لعیں — آسماں ہل گئے تھرا گئی مقتل کی زمیں
کیا کہوں تیغ کو کس طرح گلے پہ رکھا
پاؤں قرآں پہ رکھا حلق پہ خنجر رکھا

[illegible] میں، لڑائی میں بھی
ڈھال کو چھوڑ کے ... ٹوٹا نہ لڑائی میں بھی
تیغ حیدر نے کی ... صفائی میں بھی
فرق آیا نہ سر و تن کی جدائی میں بھی
کس ... کا بھی نہ ایسا نہ اشارہ دیکھا
جس نے اک وار چلایا ... اس کو دوبارہ دیکھا

[illegible] طاقت جس میں
نقش وہ نقش کہ سب برق کی سرعت جس میں
تیغ وہ تیغ، عیاں موت کی صورت جس میں
ہاتھ وہ ہاتھ، یداللہ کی طاقت جس میں
روک لے وار، جگر کیا کسی بے پیر کا ہے
زور وہ جس میں اثر فاطمہ کے شیر کا ہے

جنگ میں پیاس کا صدمہ شہ دیں سے پوچھو
تن تنہا کی وغا، اقلیم کیں سے پوچھو
زلزلہ دشت پہ آفت کا، زمیں سے پوچھو
ضرب شمشیر وہ سر، روح امیں سے پوچھو
باپ اس فوج میں تنہا، پسر اس لشکر میں
کربلا میں یہ تلاطم ہوا، یا خیبر میں

اسداللہ کے صدقے، شہ والا کے نثار
وہی حملے تھے، وہی زور، وہی تھی تلوار
فتح حیدر نے کیا جنگ میں خیبر کا حصار
مورچے فوج کے حضرت نے بھی توڑے کئی بار
کیوں نہ ہو احمد مرسل کے نواسے تھے حسین
فرق اتنا تھا کہ وہ روز کے پیاسے تھے حسین

ہر طرف فوج میں غل تھا کہ دہائی، مولا!
ہم نے دیکھی ترے ہاتھوں کی صفائی مولا!
الاماں! خوب سزا جنگ کی پائی مولا!
آپ کرتے ہیں بروں سے بھی بھلائی مولا!
ہاتھ ہم باندھتے ہیں، پھینک کے شمشیروں کو
بخشیے! امت جاہل کی تقصیروں کو

آئی ہاتف کی یہ آواز، کہ اے عرش مقام
یہ وغا تیسرے فاقے میں، بشر کا نہیں کام
اے محمدؐ کے جگر بند، امام ابن امام!
لوح محفوظ پہ، مرقوم ہے صابر ترا نام
اب نہیں حکم، لعینوں سے وغا کرنے کا
ہاں، یہی وقت ہے، وعدے کے وفا کرنے کا

آج ہے، آٹھوں بہشتوں کی نئی تیاری
نخل سرسبز ہیں، فردوس میں نہریں جاری
شب سے حوریں ہیں مکلل بہ جواہر ساری
خانۂ دوست میں ہے، دوست کی مہماں داری
پیشوائی کو، رسول الثقلین آتے ہیں
عرش تک شور یہی ہے، کہ حسین آتے ہیں

تھم گئے سن کے یہ آواز، شہ جن و بشر
روک کر تیغ کو فرمایا کہ حاضر ہے یہ سر
صید ہو، جلد اگر ذبح کریں بانی شر
شمر اظلم ہے کدھر؟ کھینچ کے آئے خنجر
ہے وہ عاشق، جو فدا ہونے کو موجود رہے
بس، مری فتح یہی ہے کہ وہ خوشنود رہے

Scanned by CamScanner

ع عباس الفاظ کی روانی سے ہوشیار

لیکن یہی بہن جب بھائی کو جنگ کے لیے رخصت کرتی ہے تو وہاں صرف ایک بھائی کھڑا ہوتا ہے اور تمام مقام و مرتبے بھول کر وہ
ایک جان بچھڑ کے ان بہن بن جاتی ہیں۔ بھائی کی لاش کو دیکھ کر تڑپ اٹھتی ہے

ع بھیا میں اب کہاں سے تمہیں لاؤں کیا کروں

ع بھیا ! بتاؤ ، کیا تہ خنجر گزر گئی

۔ وہ جانب کر ہاتھوں سے منہ بنت علی چلائی ذبح ہوتے ہو مرے سامنے ہے ہے بھائی

یہ صرف دو تین رشتوں کی مثالیں تھیں ورنہ کلام انیس سے ایسی ہزاروں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ میدان جنگ میں دشمن کے سپاہی
امام حسین پہ طنز کرتے ہیں ع

مرنے والے انہیں جیتے جو ستائیں کہاں میں

10.4.7 رزم نگاری

رزمیہ لکھنے میں انیس کو بے پناہ مہارت حاصل تھی۔ اردو شاعری پر ایک بہت بڑا اعتراض تھا کہ عشق و محبت، ہجر و وصال، شمع و پروانہ
گل و بلبل کے تذکروں کے سوا کچھ نہیں۔ اردو شاعری کا مرد محبوب کی جدائی میں صرف روتا رہتا ہے جو انسانی فطرت کے خلاف تھا۔ حوصلہ
ہمت، بہادری، شجاعت، استقلال، جوانمردی جیسے جذبات اردو شاعری سے تقریباً مفقود تھے۔ قصیدے میں کہیں کہیں ممدوح کی تعریف میں
انتشار کے ساتھ جنگ، گھوڑے اور تلوار کا ذکر ملتا ہے لیکن نہایت مبالغے کے ساتھ۔ مرثیے پر یہ الزام غلط ہے کہ وہ صرف بین و بکا کے لیے
لکھے جاتے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ مرثیہ نگاری کا مقصد مرنے والے کی تعریف اور شہادت پر رونا تھا۔ لیکن جب مرثیہ ایک صنف کی حیثیت
سے لکھا جانے لگا تو اس میں دوسرے بہت سے اجزا کی شمولیت نے اسے باوقار بنایا۔ طول و طویل مرثیوں میں اگر چند بند شہادت اور بین کے
نکال دیے جائیں تو یہ الزام غلط ثابت ہوتا ہے۔ مرثیہ ہی وہ صنف ہے جس میں سب سے پہلے جنگ کا ذکر ہمت و شجاعت اور جوانمردی کے
کارنامے ملتے ہیں۔

انیس کے متعلق مشہور ہے کہ ان کے گھر کا ایک وسیع کمرہ رزم نگاری کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ یہاں دیواروں پر مختلف قسم کے ہتھیار
لگے رہتے تھے۔ جن کے استعمال اور حملہ و دفاع کی باریکیوں سے انیس واقف تھے۔ اور جس وقت وہ رزمیہ اشعار لکھتے تھے ان پر ایک کیفیت
طاری ہوتی تھی اور وہ خود کو کمرے میں بند کر لیتے تھے۔ اس وقت کسی کی مجال نہ تھی کہ [illegible] انہوں نے اردو شاعری کو رزمیہ عناصر سے مالامال کر دیا۔ کوئی مرثیہ اٹھا کر دیکھ لیجیے اس میں سب سے تفصیلی بیان رزم کا ہے۔ وہ خود دعویٰ
کرتے ہیں

رزم ایسی ہو کہ دل سب کے پھڑک جائیں ابھی
بجلیاں تیغوں کی آنکھوں میں چمک جائیں ابھی

ظاہر ہے مرثیہ نگاری سے ان کا مقصد صرف رونا رلانا نہیں تھا بلکہ حق کی طرف لوگوں کو دعوت دینا تھا کہ امام حسین نے جس صبر و
استقامت کے ساتھ ظلم، شر اور بدی کا مقابلہ کیا اس سے لڑنے کے لیے انسانوں میں جہاد کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ اور وہ اس مقصد میں بڑی حد
تک کامیاب ہوئے۔ جنگ کی ایسی باریکیوں کا ذکر دبیر کے سوا کسی دوسرے مرثیہ نگار کے یہاں نہیں ملتا۔ لیکن انیس اس معاملے میں بے مثل
ہیں فرماتے ہیں:

طاقت اگر دکھا دوں رسالت مآب کی
رکھ دوں زمین پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی

مراثی انیس میں مکالمہ نگاری [illegible] زبان و بیان پر قدرت [illegible] ملتی ہیں ان کی نظیر اردو نظم و نثر کی پوری تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔ مکالمہ نگاری کے لیے [illegible] [illegible] انسانی نفسیات اور فصاحت و بلاغت نہایت ضروری ہے۔ [illegible] جزوں کا بڑا اہتمام کیا ہے۔ [illegible] چاہیں۔ انہوں نے اپنے کلام میں ان ساری [illegible] نمایاں ہے۔ [illegible] کیا مکالمہ زبان کے فطری حسن کو ختم [illegible] اور معمولی انسان نہیں تھے۔ [illegible] مشکل [illegible] کے لیے یہ کام اور بھی مشکل تھا کیوں کہ ان کے ان کے تمام [illegible] نہایت [illegible] جذبات کو بھی مرثیے سے الگ رکھنا تھا۔ اس کے باوجود بھی صاف نظر آتی ہے۔ [illegible] اخلاقی قدروں کے نمونے نظر آتے ہیں۔ ان کے مکالموں میں [illegible] کی تہذیب کی [illegible] کرتے ہوئے فرماتی ہیں۔ حضرت عباس کو فوج کی علم برداری دی گئی تو ان کی زوجہ حضرت زینب (حضرت عباس کی بڑی بہن) کا شکریہ ادا

فیض آپ کا ہے اور تصدق امام کا   عزت بڑھی کنیز کی رتبہ غلام کا

جواب میں حضرت زینب فرماتی ہیں

مرکو لگا کے چھاتی سے زینب نے یہ کہا   تو اپنی مانگ کوکھ سے ٹھنڈی رہے سدا

مکالموں کی سادگی اور لکھنوی تہذیب نے ان مکالموں کو تاثیر میں حد درجہ بڑھا دیا ہے۔ حضرت زینب فوج کی علم برداری ملنے کے بعد اپنے چھوٹے بھائی حضرت عباس سے فرماتی ہیں۔

ہو جائے آج صلح کی صورت تو کل چلو   ان آفتوں سے بھائی کو لے کر نکل چلو

اسی موقع پر زوجہ عباس کو دعا دیتے ہوئے فرماتی ہیں۔

مہندی تمہارا لال ملے ہاتھ پاؤں میں   لاؤ دلہن کو بیاہ کے تاروں کی چھاؤں میں

یہاں بھی زبان کی سادگی کے ساتھ ساتھ لکھنوی تہذیب نمایاں ہے۔

انیس کرداروں کی زبان دو طرح کی ہے۔ یعنی ایک وہ جو گھر میں اعزا اور خردوں و بزرگوں کے ساتھ بولتے تھے۔ دوسری وہ جو لکھنؤ کے شرفا گھر سے باہر بولتے تھے۔ انیس نے مختلف انواع کے کرداروں میں ان موقعوں کا لحاظ رکھا ہے۔ جہاں کہیں حفظ مراتب کا معاملہ درپیش ہو وہاں تخاطب مرتبے کے لحاظ سے ہے ورنہ عام طور پر رشتے کے نام سے تخاطب کیا گیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ حضرت زینب فرماتی ہیں۔

قرآں کے بعد ہے بھی تو ہے آپ کا کلام   گر مجھ سے پوچھتے ہیں شبہ آسماں مقام

اپنے بچوں کو تنبیہ کرتی ہیں۔

زینب نے تب کہا کہ تمہیں اس سے کیا ہے کام!   کیا دخل مجھ کو مالک و مختار ہیں امام

بچے ماں سے کہتے ہیں

ع   غصے کو آپ تھام لیں اے خواہر امام

....

ع   نرغے میں تین دن سے ہے مشکل کشا کا لال

بولیں بہن کہ آپ بھی بولیں کسی کا نام   ہے کس طرف توجہ سرکار خاص و عام

حضرت عباس فوج کی سپہ سالاری ملنے پر شکریہ ادا کرتے ہیں تو حضرت زینب فرماتی ہیں۔

Scanned by CamScanner

وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار
پھولوں پہ جابجا وہ گہر ہائے آبدار
اٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار
بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار
خواہاں تھے نخل گلشن زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے

ٹھنڈی ٹھنڈی وہ ہوائیں، وہ بیاباں، وہ سحر
دم بدم جھومتے تھے وجد کے عالم میں شجر
اوس نے فرش زمرد پہ بچھائے تھے گہر
لوٹی جاتی تھی لہکتے ہوئے سبزے پہ نظر
دشت سے جھوم کے جب باد صبا آتی تھی
صاف غنچوں کے چٹکنے کی صدا آتی تھی

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

10.4.5 واقعہ نگاری

کسی واقعے کو تسلسل کے ساتھ تحریر کرنا بذات خود ایک فن ہے۔ واقعہ نگاری میں جذبات کی شمولیت ضروری ہے۔ واقعہ صرف ایک منظر نہیں جسے سپاٹ اور سادہ لفظوں میں پیش کر دیا جائے بلکہ اس واقعہ کی جزئیات کی تفصیل بیان کرنا ہی واقعہ کو پر اثر بنا دیتا ہے۔ اصل واقعہ میں شاعر اپنے مشاہدے اور تخیل سے ایسی رنگ آمیزی کرتا ہے گویا وہ جائے وقوع پر خود موجود تھا۔ انیس نے جہاں جہاں واقعہ نگاری کی ہے وہاں گویا جیتی جاگتی تصویریں پیش کر دی ہیں۔

حضرت عباس کو علم داری سونپنے کا موقع ہے۔ حضرت عون و محمد علم داری کی خواہش رکھتے ہیں لیکن کمسن ہونے کے سبب وہ کھل کر اس خواہش کا اظہار نہیں کر سکتے بلکہ ماں کے سامنے اشاروں اشاروں میں اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔

گہ ماں کو دیکھتے تھے کبھی جانب علم
نعرہ کبھی یہ تھا کہ نثار شہ امم
کرتے تھے دونوں بھائی کبھی مشورے بہم
آہستہ پوچھتے کبھی ماں سے وہ ذی حشم
کیا قصد ہے علی ولی کے نشان کا؟
اماں! کسے ملے گا علم نانا جان کا

حضرت زینب ان کا اشارہ سمجھ کر گھبرا جاتی ہیں اور بچوں کو تنبیہ کرتی ہیں کہ اپنی عمر اور حوصلے سے زیادہ خواہش رکھنا مناسب نہیں۔ اس کو انیس نے بڑی خوبصورتی سے نظم کیا ہے جو واقعہ نگاری کے ساتھ ساتھ انسانی نفسیات کا بہترین مرقع ہے۔

عمریں قلیل اور ہوس منصب جلیل
اچھا نکالو قد کے بھی بڑھنے کی کچھ سبیل
ماں صدقے جائے گرچہ یہ ہمت کی ہے دلیل
ہاں اپنے ہم سنوں میں تمہارا نہیں عدیل
لازم ہے سوچے، غور کرے، پیش و پس کرے
جو ہو سکے نہ، کیوں بشر اس کی ہوس کرے!

Scanned by CamScanner

تھی۔ رخصت کے وقت ایسے الوداعی الفاظ منہ سے نکلتے ہیں

سب دیکھنے والے بس بن کے یہ تقریر
لو میر (؟) رو رو کے کہتی ہے یہ تاثیر
چھاتی سے لگا کے اسے کہنے لگے شبیر
منہ دیکھ کے چپ ہو گئی وہ بے کس و دلگیر

نزدیک تھا دل چیر کے پہلو نکل آئے
'اچھا' تو کہا منہ سے، پہ آنسو نکل آئے

جذبات کے اصلی منظر پیش کر کے ... دیتے ہیں۔ حضرت قاسم فاطمہ کبریٰ سے شادی کے فوراً بعد میدان جنگ کو سدھارتے ہیں۔ ایک شب کی دلہن شرم کے مارے اپنے جذبات کا اظہار نہیں کر سکتی۔ انیس نے بڑی خوبصورتی سے اس واقعہ کو پیش کر دیا ہے۔ جو بڑا فطری سا لگتا ہے۔

یارب دلہن پہ مجھے گزری ہے ایک شب
دولہا جو مر گیا تو مجھے کیا کہیں گے سب
اب تک تو شرم سے نہ ہلائے تھے میں نے لب
پر کیا کروں کہ اب ہے مری روح پر تعب

شبیر کے آفتاب کا وقت غروب ہے
دولہا سے پہلے مجھ کو اٹھا لے تو خوب ہے

10.4.4 منظر نگاری

اردو میں منظر نگاری کے کچھ نمونے مثنویوں تک محدود ہیں۔ اردو میں مرثیہ وہ واحد صنف ہے جس میں منظر نگاری کے اعلیٰ ترین نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ کربلا کے بے آب و گیاہ میدان میں پیڑ پودے اور جنگل وغیرہ کا ذکر بے معنی ہے لیکن چہرے یا تمہید کے بندوں میں انیس نے خوب خوب کمالات دکھائے ہیں۔ جنگ کے وقت منظر کا بیان تو سورج کی تمازت، ریت کی تپش اور لو، دھوپ کے تھپیڑوں تک محدود ہے لیکن اس محدود منظر میں بھی انیس نے ایسی ایسی گل کاریاں کی ہیں کہ موسم بہار کے مناظر بھی پھیکے پڑ جائیں۔

وہ لو، وہ آفتاب کی حدت، وہ تاب و تب
کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثال شب
خود نہر علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب
خیمے جو تھے حبابوں کے، تپتے تھے سب کے سب

اڑتی تھی خاک، خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی، فرات کا

اسی مرثیے کے چہرے میں نہایت خوبصورت اور ٹھنڈی صبح کا منظر پیش کیا ہے۔

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور
دیکھے تو غش کرے ارنی گوے اوج طور
پیدا گلوں سے قدرت اللہ کا ظہور
وہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خواں طیور

گلشن خجل تھے وادی مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کے باس سے

Scanned by CamScanner

کیے جاتے ہیں

سر شرمائے قد' اس طرح کا قامت ایسی ‏ ‏ اسد اللہ کی تصویر تھے صورت ایسی
شیر نعروں سے دہل جاتے تھے صورت ایسی ‏ ‏ جا کے پانی نہ پیا نہر میں ہمت ایسی

جان جب تک تھی اطاعت میں رہے بھائی کی
تھے علم دار مگر بچوں کی سقائی کی

نسوانی کرداروں میں حضرت زینب کا کردار بے مثل ہے ۔ رسولؐ کی نواسی' علی کی بیٹی اور امام حسین کی بہن کا کردار پیش کرنا کچھ آسان کام نہ تھا ۔ یہ وہ بہن تھی جس نے اپنے زور خطابت سے واقعہ کربلا کا رخ موڑ دیا اور شہادت حسین کو یزید کی ذلت و رسوائی کا سبب بنادیا۔ امام حسین کے ساتھ ہر ہیرو کی شہادت پر حضرت زینبؓ بین کرتی نظر آتی ہیں اور ہر شہادت پر امام حسینؑ بہن کو ڈھارس بندھاتے نظر آتے ہیں ۔لیکن اسی چاہنے والے بھائی کی لاش پر رونے والی صرف چند عورتیں خیمے میں تھیں ۔حضرت زینب بے قرار ہو کر بھائی کی شہادت کی خبر سن کر کھلے سر' برہنہ پا' میدان جنگ کی طرف بھاگتی ہیں

پردہ الٹ کے بنت علی نکلی ننگے سر ‏ ‏ لرزاں قدم' خمیدہ کمر' غرق خوں' جگر
چاروں طرف پکارتی تھی سر کو پیٹ کر ‏ ‏ اے کربلا بتا! تیرا مہمان ہے کدھر

اماں قدم اب اٹھتے نہیں تشنہ کام کے
پہنچا دو لاش پر' مرے بازو کو تھام کے

10.4.3 جذبات نگاری

واقعہ کربلا ایک المیہ ہے اور درد و غم کے بیان میں جذبات جس طرح کھل کر سامنے آتے ہیں ویسا اور کوئی دوسرا موقع انسان کی زندگی میں نہیں آتا ۔ ہر موقع پر انسان اپنے جذبات کو چھپا سکتا ہے لیکن رنج و غم اس کی آنکھوں سے عیاں ہو جاتے ہیں ۔ امام حسینؑ کی پوری زندگی درد و غم کا ایک ایسا لا متناہی سلسلہ تھی جسے انہوں نے صرف صبر و رضا کے راستے طے کیا۔ ان کے ساتھ بوڑھے' بچے' عورتیں اور جوان بہتر (72) کی تعداد میں موجود تھے ۔ ان سب کے جذبات الگ الگ مگر مقصد حیات صرف ایک یعنی شہادت ۔ اس واقعے میں غم' غصہ' الفت' نفرت' تاسف' شرمندگی وغیرہ بہتروں طرح کے جذبات ہیں لیکن انیس کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ہر موقع پر جذبات کی عکاسی بڑے سلیقے سے کی ہے اور کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان جذبات کا اظہار پورا نہیں ہوا' یوں کیا ہوتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔ انسانی فطرت پر ان کی بے مثل گرفت تھی ۔ وہ صرف شہیدوں کی لاش پر گریہ کرنے کو جذبات نگاری نہیں سمجھتے بلکہ انسانوں کے ہر عمل میں جذبات کے نمونے دیکھتے اور پیش کرتے ہیں ۔ حضرت زینبؓ نہایت جری خاتون ہونے کے باوجود اپنے بھائی کو آفت میں گرفتار نہیں دیکھ سکتیں اور ان کے الفاظ دعا بن کر پھوٹ پڑتے ہیں:۔

سر پر نہ اب علی' نہ رسول فلک وقار ‏ ‏ گھر لٹ گیا' گزر گئیں خاتون روزگار
اماں کے بعد روئی حسن کو میں سوگوار ‏ ‏ دنیا میں اب حسین ہے ان سب کی یادگار

تو داد دے مری کہ عدالت پناہ ہے
کچھ اس پہ بن گئی' تو یہ مجمع تباہ ہے

مدینے سے رخصت کے وقت حضرت ام البنین (حضرت عباس کی والدہ) اور حضرت فاطمہ صغراؓ امام حسین کے ساتھ کربلا نہ آ سکی

Scanned by CamScanner

بھی ہے اسی لیے انیس کے مرثیوں کو "شیریں بیانی" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہاں ہم ان کے مرثیوں کی چند اہم خصوصیات کے بارے میں گفتگو کریں گے۔

10.4.1 سراپا نگاری

میر انیس نے اپنے مرثیوں میں سراپا نگاری سے اکثر گریز کیا ہے۔ خصوصاً رسول اکرم اور ائمہ اطہار کے سراپے لکھنے میں احتراماً گریز کیا ہے۔ البتہ امام کے گھر والوں اور رفقائے حسین کے سراپے ضرور لکھے ہیں۔ ان میں بھی علی اکبر، حضرت قاسم اور حضرت عباس کے سراپے بڑے جوش و عقیدت سے لکھے ہیں۔ رفقائے حسین کا مجموعی سراپا دیکھیے

وہ چاند سے ماتھے، وہ قبائیں، وہ عبائیں
تسبیحیں تو ہاتھوں میں، زبانوں پہ دعائیں
تن پھول سے، غنچوں کی طرح تنگ قبائیں
بس جائے وہ سب راہ، یہ جس راہ سے جائیں
نور سے کمال بھی جنے کو نہ پہنچے
بو ایسی کہ عطر ان کے پسینے کو نہ پہنچے

10.4.2 کردار نگاری

اردو شاعری میں کردار نگاری یا سیرت نگاری گویا تھی ہی نہیں۔ اس کے کچھ نمونے مثنویوں میں مل جاتے ہیں۔ لیکن وہ اکثر غیر فطری یا مافوق الفطرت عناصر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ کردار نہ تو تاریخی ہیں اور نہ ان کے ساتھ لوگوں کا جذباتی تعلق ہے۔ یہ کردار ہماری زندگی کے جیتے جاگتے کردار نہیں بلکہ ہماری روزمرہ زندگی سے خاصے دور ہیں۔

مرثیے کے کردار نہ تو مافوق الفطرت عناصر سے تعلق رکھتے ہیں اور نہ فرضی کردار ہیں بلکہ واقعہ جس طرح پیش آیا تھا وہ حقیقی ہونے کے ساتھ ساتھ درد و اثر بھی رکھتا ہے۔ یہی کیفیت ان کے کرداروں کی بھی ہے، جو عمل اور تاثیر میں بے مثل ہیں۔ انہوں نے دو طرح کے کردار تراشے ہیں جو خیر و شر کے مجسمے ہیں۔ یعنی امام حسینؑ کا مختصر گروہ اور یزیدی فوج کا ہزاروں کا لشکر۔ حسینی جماعت کے افراد مثالی پیکر ہونے کے باوجود فوق البشر خصوصیات کے حامل نہیں بلکہ اپنی تخلیقی قوت سے انہوں نے ایسے کردار پیش کیے ہیں جنہیں ہم تمام انسانوں سے قریب تر سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔ سب سے مکمل اور مثالی کردار امام حسینؑ کا ہے جس پر پورے واقعہ کربلا کا دار و مدار ہے۔ یہ کردار انیس نے اپنے تمام مرثیوں میں الگ الگ تحریر کیا ہے۔ لیکن ہر جگہ تاثر ایک سا ہے۔ دوسرے شہدا کے حال کے مرثیوں میں بھی امام حسینؑ کا ذکر لازمی ہے۔ وہ حق پرستی، حق گوئی، کنبہ پروری، اعلیٰ اخلاق، مروت، محبت اور شجاعت کا مثالی پیکر ہیں۔

نماز صبح کے بعد وہ بے خوف ہو کر اپنے ساتھیوں کو جنگ کرنے اور جان دینے کی دعوت دیتے ہیں گویا ان کی تخلیق ہی اسی مقصد کے لیے ہوئی تھی:

ہاں غازیو! یہ دن ہے جدال و قتال کا
یاں خوں بہے گا آج محمدؐ کی آل کا
چہرہ خوشی سے سرخ ہے زہرا کے لال کا
گزری شب فراق، دن آیا وصال کا
ہم وہ ہیں غم کریں گے ملک جن کے واسطے
راتیں تڑپ کے کاٹی ہیں اس دن کے واسطے

حضرت عباسؑ، جو قوت بازو تھے ان کا کردار حضرت علی کے مماثل لکھا ہے جو شجاعت، ہمت اور مردانگی میں بے مثل تھے۔ حسینی فوج کے علم دار کی حیثیت سے تمام مرثیوں میں ان کا ذکر بڑی تفصیل سے آیا ہے۔ یہاں طوالت کے خوف سے صرف دو بند انیس کے کلام سے نقل

Scanned by CamScanner

1857 (3) 1757 (2) 1874 (1)

10.4 انیس کی مرثیہ نگاری کی خصوصیات

انیس کے مرثیوں میں زبان و بیان کے حیرت انگیز تجربے ملتے ہیں ۔ ان میں ان کی قادرالکلامی، فنی تبحر، انسانی نفسیات، اخلاقی اقدار، رزم کے ہنگامے، بزم کی رعنائیاں، کردار نگاری، منظر نگاری، جذبات نگاری، سراپا نگاری، تاریخ، تہذیب، فصاحت و بلاغت کا ہر نقش نظر آتا ہے۔ ان کے مرثیوں میں تقریر و خطابت کی جھلک بھی ہے، مجلس کے ماحول کی پابندیاں بھی ہیں اور سامعین کو تڑپانے والی کیفیت بھی ہے۔ انہوں نے صنائع بدائع سے بھی اپنے کلام کو سنوارا ہے۔ ان کے یہاں موقع و محل کے لحاظ سے مکالمے بھی ہیں اور الفاظ و تراکیب کا استعمال

Scanned by CamScanner

10.3.1 انیس کی مرثیہ خوانی

لکھنؤ میں داستان گوئی' مثنوی خوانی اور مشاعروں کا رواج عام تھا۔ اس کے پڑھنے والے الفاظ کی ادائیگی' آواز کے اتار چڑھاؤ اور اپنے حرکات وسکنات سے ایسا سماں باندھتے ہیں کہ مجمع مسحور ہو جاتا تھا اور یہ سلسلہ رات بھر جاری رہتا۔ مرثیے کا شمار بھی ان اصناف میں ہوتا ہے جس میں ڈرامائی عناصر کی کثرت ہے۔ ایک طویل مرثیہ پڑھنے کے لیے زبان و بیان کے ساتھ ساتھ حرکات وسکنات سے کام لینا بھی ضروری ہے۔ انیس اپنے دور کے سب سے مقبول مرثیہ خواں تھے جو مرثیہ گوئی کے ساتھ ساتھ مجمع کی نفسیات سے بھی خوب واقفیت رکھتے تھے۔

ان کی مرثیہ خوانی کے بارے میں بڑے بڑے شعرا اور ادبا اس باب میں ہم خیال ہیں کہ انہوں نے انیس جیسا ماہر فن مرثیہ خواں کبھی نہیں دیکھا۔ وہ لفظوں سے زمین' آسمان' صحرا' فرات' حملہ' دفاع وغیرہ کی ایسی تصویریں کھینچتے تھے کہ مجمع مسخر ومبہوت ہو جاتا تھا اور وہ ساری چیزیں اس کی نگاہوں کے سامنے تصویر بن کر کھڑی ہو جاتی تھیں۔ رزم خوانی پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ ایسا سماں باندھتے تھے کہ مجمع کھڑا ہو جاتا تھا۔

مرثیہ خواں کے لیے ضروری ہے کہ وہ مرثیہ خوانی میں آواز' لہجہ' ادائے الفاظ' چشم و ابرو کے اشارے اور آواز کے نشیب وفراز پر قابو رکھے اور انہیں برموقع برمحل استعمال کرے۔ میر انیس مرثیہ خوانی کے ان آداب سے خوب واقف تھے۔

10.3.2 وفات

19 شوال 1291ھ م 10 دسمبر 1874ء کو لکھنؤ میں ان کا انتقال ہوا۔ تقریباً ایک ماہ بیمار رہے۔ اپنے باغ واقع چوبداری محلہ میں دفن ہوئے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر قمری حساب سے 73 سال چند مہینے اور شمسی حساب سے 71 برس کی تھی۔ ان کی مجلس مرزا دبیر نے میر باقر کے امام باڑے میں پڑھی اور ایک بے مثل مسدس اور تاریخ وفات لکھی جس کا تیسرا شعر زباں زد ہر خاص و عام ہے:

آسماں بے ماہِ کامل' سدرہ بے روح الامیں
طور سینا بے کلیم اللہ' و منبر بے انیس

لوگوں نے انیس و دبیر کو لڑانے اور ان میں غلط فہمیاں پھیلانے کی بڑی کوشش کی لیکن کبھی ان دونوں کے دلوں میں میل نہیں آیا۔ بلکہ یہ دونوں صاحبان علم وفن ایک دوسرے کے مداح تھے۔ انیس کی جدائی میں دبیر بستر سے لگ گئے اور تقریباً تین ماہ بعد دبیر نے بھی انتقال کیا۔

اپنی معلومات کی جانچ

Scanned by CamScanner

10.3 حیات

انیس کا تعلق ایک نہایت شریف، مہذب اور تعلیم یافتہ گھرانے سے تھا۔ ان کے پڑدادا میر ضاحک دلی سے تعلق رکھتے تھے اور اچھے شاعر تھے۔ انہوں نے شاعری کی جملہ اصناف میں طبع آزمائی کی۔ ان کی بیٹے میر حسن اپنی معرکۃ الآرا مثنوی سحر البیان کے سبب مشہور ہوئے۔ ان کے بیٹے میر خلیق نے مرثیہ گوئی میں خصوصاً بڑا نام پیدا کیا۔ خلیق نے فیض آباد میں سکونت اختیار کی اور یہیں 1803ء میں وہ بچہ پیدا ہوا جس کا مرثیہ گوئی میں آج تک جواب نہ مل سکا۔ میر خلیق کے دو بیٹے اور تھے۔ میر مہر علی اُنس اور میر نواب مونس۔ یہ بھی شاعر تھے لیکن میر انیس کے مقام و مرتبے تک کوئی نہیں پہنچ سکا۔ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت ماں کی آغوش میں ہوئی جو خود ایک تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ سترہ سال کی عمر میں وہ خلیق کے ساتھ لکھنؤ آ گئے اور تعلیم کے اعلا مدارج طے کیے۔ فارسی اور عربی بہت اچھی جانتے تھے۔ قرآن و حدیث، منطق و فلسفہ، فنونِ سپہ گری وغیرہ پر غیر معمولی قدرت رکھتے تھے جس کا اظہار ان کے مرثیوں میں جابجا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ علم نجوم، طب، رمل، تاریخ اسلام اور جغرافیہ وغیرہ کا خاصہ علم تھا۔ زبان و بیان کے ساتھ ساتھ ان علوم نے بھی ان کے مرثیوں کو اعلیٰ تخلیقی ادب کا درجہ دیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی باکمال شخصیت اعلیٰ اخلاقی قدروں کی مالک تھی۔ انیس حسن سیرت اور حسن صورت کا مجموعہ تھے۔

تعلیم و تربیت نے انہیں سخت کوش، مہذب اور وقت کا پابند بنا دیا تھا۔ مزاجاً وہ نہایت متین، سنجیدہ، خوددار اور مہذب انسان تھے۔ شخصیت کی ان خوبیوں کا اثر ان کے کردار پر بھی پڑا۔ وہ نہایت پاکیزہ خیال، متقی، پرہیزگار اور وضعدار انسان تھے۔

وہ اپنے اصول اور وضعداری کے پابند تھے اور حتی الامکان اُسے نباہنے کی کوشش کرتے تھے۔ لکھنؤ سے باہر جا کر مجلس پڑھنا انہیں قطعی پسند نہ تھا۔ بہت سے امرا، رؤسا اور جاگیرداروں نے خواہش کی کہ انیس ان کے یہاں مجلس پڑھیں۔ لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ لیکن انتزاعِ سلطنت کے بعد مجبوری حالات نے انہیں نہ صرف پٹنہ، الہٰ آباد و لکھنؤ کے سفر کرائے بلکہ نواب تہور جنگ کے بے حد اصرار پر حیدرآباد کا سفر بھی کیا۔ لیکن تھک کر اور دب کر کہیں جانا منظور نہ کیا۔ یہ سفر انہوں نے 1858ء اور 1859ء میں کیے جب وہ پچپن سال کی ادھیڑ عمر کو پہنچ گئے تھے۔ قناعت اور توکل ان میں حد درجہ تھا۔ خدا کے سوا انہوں نے کبھی کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کیا۔

انیس کی مرثیہ گوئی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ہندوستانی اور سیکولر عناصر کو اپنے کلام میں جگہ دی اور اس نے عام انسانوں کو مرثیے کی طرف آنے کی دعوت دی۔ انہوں نے اس لکھنوی تہذیب کو اپنے مرثیوں میں محفوظ کر دیا۔ جس کا چرچا آج بھی لوگ فخریہ انداز میں کرتے ہیں۔ یہ مرثیے شرافت کے اعلیٰ ترین معیار کا نمونہ ہیں۔

Scanned by CamScanner

مرثیہ

سوال: مرثیہ کسے کہتے ہیں؟ مرثیہ کی تعریف کرتے ہوئے اس کے اجزائے ترکیبی پر روشنی ڈالئے۔

جواب: مرثیہ اردو شاعری میں بیش بہا خزانہ ہے۔ اردو غزل میں غزل کی سادگی وسوز وگداز، قصیدے کی شان وشوکت، مثنوی کا انداز بیان، رزم وبزم کی مرقع کشی، فطرت نگاری، انسانی رشتوں اور تعلقات کی ترجمانی حق وباطل کی جنگ وغیرہ سب ہی کچھ شامل ہے۔

مرثیہ اس نظم کو کہتے ہیں جو کسی کے مرنے پر لکھی جائے اور جس میں مرنے والے کی خوبیاں بیان کی جائیں اور اپنے غم واندوہ کا اظہار کیا جائے۔ مثلاً مولانا الطاف حسین حالؔی نے غالبؔ کی وفات پر ان کا مرثیہ لکھا تھا جو بہت مشہور ہے۔ اسی طرح علامہ اقبال نے داغ کا مرثیہ کہا تھا لیکن اردو میں عام طور پر مرثیہ اس نظم کو کہا جاتا ہے جس میں کربلا کے اندوہ واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔ حضرت امام حسین اور ان کے ساتھیوں کے شہید ہونے کا ماتم کیا جاتا ہے۔ مرثیے کیلئے کوئی ایک فارم مقرر نہیں ہے۔ عہد سودا اور اس سے قبل مرثئے مربع، ترکیب بند، ترجیع بند، مخمس ترجیع بند، مثنوی اور غزل وغیرہ کی شکل میں لکھے جاتے ہیں۔

بعض ادبی مورخین کا خیال ہے کہ مرثیہ کو پہلی بار جس نے مسدس کی شکل دی وہ مرزا محمد رفیع سودا ہیں۔ بعد میں مرثیہ کی ہی فارم سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ شبلی نے بھی موازنہ انیس ودبیر میں لکھا ہے۔ سودا پہلے شاعر ہیں جنہوں نے مرثیہ مسدس کی شکل میں لکھا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ سوداؔ کے ایک معاصر سکندر مرثیہ گو نے پہلی بار مرثیہ کو مسدس کی شکل دی۔ مرثیہ کے اجزائے ترکیبی حسب ذیل ہیں؛

۱۔ چہرہ..... اس میں صبح کا منظر، رات کا سماں، دنیا کی بے ثباتی، باپ بیٹے سے تعلقات، سفر کی دشواریاں، اپنی شاعری کی تعریف، حمد، نعت، منقبت اور مناجات وغیرہ تمہید کے طور پر بیان کئے جاتے ہیں۔

Scanned by CamScanner

یہ صنف اردو شاعری کے لئے سرمایہ افتخار ہو گئی اور بعض اعتبار سے غزل سے
بھی کہیں زیادہ مقبول، اس سے کہیں زیادہ پر اثر اور دل فریب!''۵ے

یہ ماننے میں کوئی حرج نہیں کہ غم واندوہ کی لپیٹ میں مجروح انسانی جذبات واحساسات اگر باطنی کیفیت اختیار کرلیں تو ایک فضا پیدا ہوتی ہے۔اس فضا کو ختم کرنے کے لئے ایسا موثر طریقہ بیان یا اظہار اپنایا جاتا ہے جس سے رگ رگ کے درد کے چشمے ابلنے لگیں ایسا معلوم ہو کہ خون دل اشک بن کر بہنے لگا اور زبان پر فریاد ہو۔تاہم درد واندوہ کا یہ انداز بیان کبھی بے ربط جملوں کی صورت میں زبان پر آتا ہے اور کبھی منظم اور مربوط جملوں میں ڈھل کر نظم کا آہنگ اختیار کر لیتا ہے

بیٹے کا دم نکل گیا بابا کے سامنے

یا پھر حضرت امام حسین کی شہادت کے موقع پر آپ کی بہن بی بی زینب یوں بین کرتی نہیں:

چلتے ہوئے کچھ مجھ سے نہ فرما گئے بھائی

بہنا کو نجف تک بھی نہ پہونچا گئے بھائی

Scanned by CamScanner

مرثیہ کا ایک ڈھانچہ قائم کیا اور ایک مستحکم وجود بخشا۔ اگر ابتدا عرب سے ہوئی تو اہل عرب کی یہ روایت تھی کہ میدان جنگ میں جب دو ہیرو آمنا سامنا کرتے تو اپنی طاقت کا زبانی مظاہرہ کرتے تھے۔ یعنی اپنے آباواجداد کی شجاعت، عظمت، قوت ایمانی کا مظاہرہ اس جوش اور جذبے سے کرتے تھے کہ سامنے والا ناتواں ہو جاتا۔ اس منظر کو مرثیہ نگاروں نے بڑی خوبصورتی اور سلیقہ مندی سے پیش کیا ہے۔ رجز کے یہ اشعار پیش ہیں:

دنیا ہو اک طرف تو لڑائی کو سر کروں
آئے غضب خدا کا اُدھر، رخ جدھر کروں
بے جبرئیل کار ِ قضا و قدر کروں
انگلی کے اک اشارے میں شق القمر کروں
طاقت اگر دکھاؤں رسالت مآب کی
رکھ دوں زمیں پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی

انیس

رزم:۔ مرثیہ کا عظیم الشان اور سب سے اہم جز رزمیہ ہے۔ اس میں جنگ بہ تفصیل اور تمام جزئیات بیان کئے جاتے ہیں۔ میدان جنگ کی تیاری، فوجوں کے ساز و سامان، تلواروں کی چمک، نیزوں کی کڑک اور بے دردی سے لڑنا ان تمام حالتوں اور کیفیتوں کو

Scanned by CamScanner

میں نظر آتے ہیں۔مثال کے طور پر یہ اشعار پیش ہیں:

اللہ رے زلزلہ کہ لرزتے تھے دشت و در
جنگل میں چھپتے پھرتے تھے ڈر ڈر کے جانور
جنات کانپ کے کہتے تھے الحذر
دنیا میں خاک اڑتی ہے، اب جائیں ہم کدھر
اندھیر ہے، اٹھی برکت اب جہان سے
لو مل گیا زمیں کا طبق آسماں سے

انیسؔ

شہادت:۔مرثیہ کا سب سے ولولہ خیز حصہ شہادت ہے [illegible]

Scanned by CamScanner

چھاتی سے پھر اک بار سکینہ کو لگائیں
کچھ بانو بھی کہہ لیویں تو سر دینے کو جائیں
بیبوں سے ملاقات کی فرصت نہ ملے گی
پھر عصر تلک بات کی مہلت نہ ملے گی

انیس

آمد:۔ رخصت اور رجز کے درمیان یہ جز اہم ہوتے ہوئے مختصر ہوتا ہے جس میں ہیرو کی میدان جنگ میں آمد کی منظر کشی کی جاتی ہے اور ساتھ ہی ہیرو کے گھوڑے اور ہتھیاروں کی

Scanned by CamScanner

دوسرے موضوع کے حوالے سے اشعار کہے جائیں جنہیں تمہید بھی کہہ سکتے ہیں یا قصیدے کی تشبیب کا مقام بھی دے سکتے ہیں۔اس میں شاعر حمد، نعت، منقبت، حضرت علی، حضرت امام حسین کے علاوہ مکہ سے سفر، سفر کے پرخطر حالات، گرمی کا موسم، صبح کا موسم بیان کرتا یا پھر اپنی شاعرانہ عظمت، قادر الکلامی، ثنا خوان اور حسین ہونے پر فخر کا اظہار کرتا ہے۔کبھی پیاس کی کیفیت کا بیان کرتا ہے، موسم گرما میں گرمی کی شدت کا بیان، صبح کا منظر، چڑیوں کی چہچہاہٹ، شبنم کا پھولوں پر گہرا آبدار بن کر چمکنا وغیرہ قسم کے مناظر تشبیہ واستعارے اور صنائع بدائع کی زرتابی کے ساتھ قلم بند کئے جاتے ہیں۔انیسؔ کے ایک مشہور مرثیے میں صبح کا منظر اس طرح بیان کیا گیا ہے۔:

وہ دشت ، وہ نسیم کے جھونکے، وہ سبزہ زار
پھولوں پہ جا بہ جا وہ گہرہائے آبدار
اُٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار
بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار (انیسؔ)

سراپا:۔ اس میں مرثیہ کے ہیرو کے کارنامے پیش کرتے ہوئے اس کی عادات و اطوار اور قد و قامت کا ذکر کیا جاتا ہے۔سراپا لکھنے میں شاعر اپنا زور قلم صرف کر دیتا ہے، جس سے شاعر کی اپنی محبت وعقیدت کا بھر پور اظہار ہوتا ہے تو دوسری طرف باطل یعنی یزیدیوں سے نفرت کا احساس بھی ہوتا ہے۔سراپا بیان کرتے وقت تشبیہات واستعارات

Scanned by CamScanner

کے علاوہ صنائع بدائع کے خزانے لٹا دیئے جاتے ہیں۔ دبیر اپنے ایک مرثیہ میں سراپا لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر میں حسین کے رخ کو آئینہ کہوں تو سمجھو کہ میں نے کچھ ثنا نہیں کی، آنکھ کو نرگس کہوں تو ان آنکھوں کے لئے کسر شان ہے کیونکہ نرگس میں نہ پلکیں نہ پتلی نہ بصارت۔ پیش ہیں چند اشعار:

؎ آئینہ کہا رخ کو تو، کچھ بھی نہ ثنا کی
صنعت وہ سکندر کی، یہ صنعت ہے خدا کی
گر آنکھ کو نرگس کہوں، ہے عین حقارت
نرگس میں نہ پلکیں ہیں، نہ پتلی، نہ بصارت

رخصت:۔ لفظ رخصت بذات خود اپنی وضاحت ہے۔ اگر ہم کربلائی مرثیہ کی ہی بات کرتے ہیں تو اس میں ہیرو یا مجاہدین اپنے اہل و اعیال اور احباب و قربا سے اجازت طلب کرتے ہیں اور میدان جنگ کا رخ کرتے ہیں۔ سر پر کفن باندھے ہوئے جانبازوں کو متعلقین بہ چشم گریاں، بہ لب لرزاں مگر قوت ایمانی کے ساتھ رخصت کرتے ہیں۔ اس موقع پر جو اشعار کہے جاتے ہیں کافی دل دوز اور دل نا برداشتہ ہوتے ہیں۔ حضرت امام حسین کی

Scanned by CamScanner

کے لئے بعض اوقات آٹھ اجزائے ترکیبی وضع کئے گئے:

۱۔ چہرہ، ۲۔ سراپا، ۳۔ رخصت،

۴۔ آمد، ۵۔ رجز، ۶۔ رزم،

۷۔شہادت، ۸۔ بین

اردو کا طرۂ دستار فضیلت (مرثیہ) جس کا ڈھانچہ میر ضمیر نے بنایا اور اس کے کینوس کو وسعت عطا کی ۔میر ضمیر کے بعد ان کے شاگرد مرزا سلامت علی دبیر وغیرہ نے جو اجزاء متعین کئے تھے ان کی پابندی خود ان کے مرثیوں میں دیکھنے کو نہیں ملتی ۔مثال کے طور پر مرزا دبیر کا یہ مشہور مرثیہ ''کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے'' یہ مرثیہ 'آمد' سے شروع ہوتا ہے ۔اس کے برخلاف ان کے باقی مرثیے فکری اور فنی اعتبار سے شاعری کے نہایت اعلیٰ نمونے پیش کرتے ہیں ۔میر ضمیر کے بنائے ہوئے مرثیے کے خاکہ میں ان کے قابل فخر شاگرد مرزا سلامت علی دبیر اور میر مستحسن خلیق کے مایہ ناز فرزند میر ببر علی انیس نے اپنی قوت تخلیق اور نہایت ارفع و اعلیٰ فنکارانہ صلاحیتوں سے ایسے خوبصورت رنگ بھرے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ میر ضمیر کے تخلیق کئے ہوئے کینوس کی بدولت ہر طرح کے مضامین کے لئے اس کی آغوش وا ہوگئی اور مرثیہ تمام اصناف سخن کے رنگا رنگ پھولوں سے بنایا ہوا ایک حسین گلدستہ بن گیا۔مرثیہ کے ان مختص اجزائے ترکیبی کی وضاحت درج ذیل میں پیش ہے:

چہرہ:۔ مرثیہ کی ابتدا براہ راست موضوع سے نہ ہو بلکہ اصل موضوع سے ہٹ کر کسی

Scanned by CamScanner

ہجو کی گئی ہو۔ یہی مماثلت مرثیہ کو قصیدہ کے قریب لاتی ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مرثیہ کے بے شمار ایسے اشعار ہیں جن کی ہیت غزل کی ہیت ہے۔ اس کے علاوہ مرثیہ کو ڈرامہ کی بھی تمام خصوصیات حاصل ہیں۔ ڈرامہ کے دو رخ یعنی ٹریجڈی اور کامیڈی (المیہ اور طربیہ) ہوتے ہیں اگر مرثیہ میں واقعات کربلا کا ذکر ہو رہا ہے تو ابتدا تا آخر پورے واقعات کی منظر کشی اس طرح پیش کی ہوگی کہ سارا منظر آنکھوں کے سامنے ہے اور شروع سے آخر تک ایک یاسیت اور حزنیہ کیفیت چھائی رہے گی۔

جہاں تک موضوعات کی بات ہے تو اردو شاعری پر چونکہ ابتدا سے ہی یہ الزام حاصل تھا اور بدنعام تھی کہ اردو شاعری کے پاس موضوعات کی کمی ہے۔ سوائے حسن و عشق، گل و بلبل اور ہجر و وصال کے کچھ بھی نہیں ہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ مرثیہ نے اردو شاعری کے اس تنگ دامنی کو وسعت بخشی۔ نورالحسن نقوی لکھتے ہیں:

Scanned by CamScanner

غزنوی کی وفات ہو جانے پر فرخی نے جو اشعار کہے ان اشعار کو بھی مرثیہ کے ابتدائی دور کی کڑی کہا جا سکتا ہے۔ الغرض اگر عربی مرثیہ یا فارسی مرثیہ کی بات کی جائے تو اس موضوع کے حوالے سے ایک کتاب درکار ہے۔ یہاں چونکہ میرا موضوع عربی یا فارسی مرثیہ نہیں ہے۔ اس لئے اپنا پہلو بچاتے ہوئے اردو مرثیہ کی تعلق سے بات کرنا ہی بہتر سمجھتی ہوں۔

اردو مرثیہ کی روایت جاننے سے قبل ضروری ہے کہ اردو مرثیہ کی ہیت، اردو مرثیہ کے موضوعات، اردو مرثیہ کے اجزائے ترکیبی کا اجمالی جائزہ پیش کیا جائے جس سے اردو مرثیہ کی اہمیت اور کامیابی کا بخوبی اندازہ ہو سکے گا۔ سب سے قبل اگر اردو مرثیہ کی ہیت کو پہچاننے کی کوشش کریں تو اردو مرثیہ کی ہیت بھی عربی اور فارسی مرثیہ کی ہیت کا ہم پلو ہے۔ اردو مرثیہ بذات خود ایک صنف محسوس نہیں ہوتی بلکہ دیگر تمام اصناف کا سنگم نظر آتا ہے۔ اگر ہم مثنوی کی بات کریں تو مثنوی کی تو یہ بنیادی صفت ہے کہ کسی واقعہ کا تسلسل کے ساتھ بیان کرنا، اسی شرط کی کسوٹی پر اگر کربلائی مرثیہ کا جائزہ لیا جائے تو کربلائی مرثیہ بظاہر ایک مثنوی کی صفات لئے ہوئے ہے جس کو مثنوی کہا جا سکتا ہے۔ اگر قصیدہ کی تعریف کو سامنے رکھ کر مرثیہ کو دیکھا جائے تو ایسی بے شمار مثالیں سامنے آتی ہیں جن سے لگتا ہے کہ یہ قصیدہ ہے۔ کیونکہ قصیدہ کے معنی ہیں کسی کی مدح یا ہجو کرنا اور مرثیہ میں بھی یہ گنجائش بدرجہ اتم موجود ہے کہ مرثیہ میں نیک سیرت شخصیات کے نیک افعال کا ذکر کیا جاتا ہے گویا ایک قسم کی مدح ہوئی دوسری طرف متعدد شخصیات کے بداعمال اور بدکردار کا ذکر بھی کیا جاتا ہے گویا ان کی

Scanned by CamScanner

کی تفصیل اور حقائق سے اچھی طرح واقف ہو۔ پہلے بھی ذکر کیا گیا ہے کہ مرثیہ کے لئے کوئی مخصوص ہیت مقرر نہیں تھی لیکن اگر ہم اپنی زبان اردو کی بات کریں تو ہمیں ایسے مرثیہ گو نصیب ہوئے جنہوں نے صنف مرثیہ کے لئے ہیت بھی قائم کی اور مرثیہ کو بام عروج پر پہنچایا۔ پروفیسر خواجہ اکرام الدین اپنی کتاب ''اردو کی شعری اصناف'' میں لکھتے ہیں:

> رثائی شاعری میں اردو مرثیے کو فنی نقطۂ نظر سے ایک خاص عظمت و وقار حاصل ہے کیوں کہ صرف اردو کو یہ فخر و امتیاز حاصل ہے کہ اس نے مرثیے کو ایک منفرد صنف سخن کی حیثیت سے متعارف کروایا، اس کے فنی اور ہیتی لوازمات کا تعین کیا اور دنیائے شاعری میں رزمیہ نظم نگاری کا بہترین نمونہ پیش کیا۔''[۳]

ابتداء میں مَیں اس بات کا کر چکی ہوں کہ صنف مرثیہ عربی سے فارسی میں داخل ہوا۔ اردو نے جس طرح دیگر شعری اصناف کو فارسی سے مستعار لیا اسی طرح صنف مرثیہ کو بھی قبول کیا اور اس قدر ترقی و ترویج دی کے یہ کہنے میں کوئی مغالطہ محسوس نہیں ہوتا کہ اردو زبان

Scanned by CamScanner

"مردے کی صفت، مردے کی تعریف، وہ نظم یا اشعار جن میں کسی شخص کی وفات یا شہادت کا حال اور مصیبتوں کا ذکر ہو" ہے۔

لیکن یہ تعریف مرثیہ کے ابتدائی دور کی ترجمانی کرتی ہے جس دور میں شخصی مرثیے لکھے گئے۔ ظاہر ہے یہ دور مرثیہ کا ابتدائی دور تھا اور عربی زبان کو یہ وصف حاصل ہے جس کی کوکھ سے مرثیہ نے جنم لیا۔ شخصی مرثیہ جیسے کے عربی زبان میں رقاشی نے جعفر برمکی کا مرثیہ لکھا۔ اس کے بعد حضرت عمر کے دور خلافت میں ایک عورت نے اپنے بھائی کا مرثیہ لکھا تھا جسے وہ گلی گلی، ڈگر ڈگر اور ہر مجمع میں پڑھتی اور سنا کر روتی اور رُلاتی پھرتی تھی۔ لیکن آج اگر مرثیہ کی بات کی جائے تو ذہن فوراً واقعات کربلا کی طرف جاتا ہے۔ چونکہ واقعہ کربلا اتنا دل دوز اور درد و اثر رکھتا ہے کہ سننے کے بعد دل پر بے ساختہ اتر جاتا ہے۔ واقعہ کربلا سے پہلے مرثیے غم و الم کے اظہار کے لئے لکھے جاتے تھے۔ کربلائی مرثیہ

Scanned by CamScanner

(الف)۔صنف مرثیہ اور اردو مرثیہ کی روایت

شعری اصناف کے تاریخی پس منظر کا اگر بغور جائزہ لیا جائے تو اس بیش قیمت سرمائے میں سے صنف ''مرثیہ'' ایک ایسی صنف ہے جسے غزل، مثنوی، قصیدہ، قطعہ، رباعی، کے علاوہ داستان کی طرح خصوصیات حاصل ہیں۔ مرثیہ ایک واحد صنف ہے جس کی ابتدا میں کوئی مخصوص ہیت نہیں تھی ابتداء میں اس میں داستان اور مثنوی کا سارنگ بھی ملتا ہے۔ ساتھ ہی مسلسل داستان کا رنگ بھی دکھائی دیتا ہے۔ علاوہ ازیں مرثیہ میں ڈرامائی رزم و پیکار کے تمام عناصر بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔ صنف ''مرثیہ'' کو اولیت کا درجہ دینے کے لئے نورالحسن نقوی کے اس قول کو بطور دلیل پیش کیا جاتا ہے۔

Scanned by CamScanner

تیر شہاب سے ہوئی خالی کمان شب
تانی نہ پھر شعاع قمر نے سنان شب

آئی جب صبح زیور جنگی سنوار کے
شب نے زرہ ستاروں کی رکھ دی اتار کے

مختصر یہ کہ مرثیہ گوئی کے فن میں میر انیسؔ نے جو کمال حاصل کیا تھا، مرزا دبیرؔ اس سے محروم رہے۔ ان دونوں کے فن مرثیہ گوئی کا بہت تفصیلی جائزہ علامہ شبلیؔ نے ''موازنہ انیسؔ و دبیرؔ'' میں لیا ہے۔

انیسؔ اور دبیرؔ کے بعد بھی مرثیہ لکھے گئے لیکن کوئی مرثیہ گو اس فن کو ان دونوں سے آگے نہیں لے جا سکا۔ انیس کے تین صاحبزادے تھے۔ سلیس، رئیس، نفیس۔ ان تینوں نے مرثیے کہے لیکن باپ کی سی شہرت نصیب نہیں ہوئی۔

آخر میں ان مرثیوں کا ذکر کیا جاتا ہے جن کا تعلق واقعات کربلا سے نہیں ہے بلکہ جو کسی کی موت پر لکھے گئے ہیں۔ مرزا غالبؔ کے دو مرثیے بہت مشہور ہیں جو غزل کی شکل میں لکھے گئے ہیں۔ ایک مرثیہ انہوں نے زین العابدین خان عارف کی وفات پر لکھا اور دوسرا اپنی کسی محبوبہ کی وفات پر۔ دونوں میں اثر اور درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ مومن کا بھی ایک مرثیہ بہت مشہور ہے۔ یہ مرثیہ محبوب کی وفات پر ترکیب بند کی شکل میں لکھا گیا تھا۔ حالیؔ نے غالبؔ کی وفات پر اور اقبال نے داغؔ کے مرنے پر مرثیے لکھے تھے جن کا شمار اردو کے بہترین مرثیوں میں ہوتا ہے۔

Scanned by CamScanner

تیر شہاب سے ہوئی خالی کمان شب — تانی نہ پھر شعاع قمر نے سنان شب
آئی جب صبح زیور جنگی سنوار کے — شب نے زرہ ستاروں کی رکھ دی اتار کے

مختصر یہ کہ مرثیہ گوئی کے فن میں میر انیسؔ نے جو کمال حاصل کیا تھا، مرزا دبیرؔ اس سے محروم رہے۔ ان دونوں کے فن مرثیہ گوئی کا بہت تفصیلی جائزہ علامہ شبلیؔ نے ''موازنہ انیسؔ و دبیرؔ'' میں لیا ہے۔

انیسؔ اور دبیرؔ کے بعد بھی مرثیہ لکھے گئے لیکن کوئی مرثیہ گو اس فن کو ان دونوں سے آگے نہیں لے جا سکا۔ انیس کے تین صاحبزادے تھے۔ سلیس، رئیس، نفیس۔ ان تینوں نے مرثیے کہے لیکن باپ کی سی شہرت نصیب نہیں ہوئی۔

آخر میں ان مرثیوں کا ذکر کیا جاتا ہے جن کا تعلق واقعات کربلا سے نہیں ہے بلکہ جو کسی کی موت پر لکھے گئے ہیں۔ مرزا غالبؔ کے دو مرثیے بہت مشہور ہیں جو غزل کی شکل میں لکھے گئے ہیں۔ ایک مرثیہ انہوں نے زین العابدین خان عارف کی وفات پر لکھا اور دوسرا اپنی کسی محبوبہ کی وفات پر۔ دونوں میں اثر اور درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ مومن کا بھی ایک مرثیہ بہت مشہور ہے۔ یہ مرثیہ محبوب کی وفات پر ترکیب بند کی شکل میں لکھا گیا تھا۔ حالیؔ نے غالبؔ کی وفات پر اور اقبال نے داغؔ کے مرنے پر مرثیے لکھے تھے جن کا شمار اردو کے بہترین مرثیوں میں ہوتا ہے۔

Scanned by CamScanner

گرمی کی شدت کا بیان ملاحظہ ہو:

مخفی تھے شرر شدت گرما سے حجر میں
چلتی تھی یہ لو آگ بھڑکتی تھی جگر میں
نے بحر میں راحت تھی کسی دل کو نہ بر میں
جھیلوں میں نہ پانی تھا نہ پتے تھے شجر میں
پایاب تھے گرمی سے وہ دریا جو بڑے تھے
سوتیں بھی نہ آتی تھیں کنویں خشک پڑے تھے

تھا مہر کی شدت سے یہ حال شہ ابرار
ماتھے سے ٹپکتا تھا عرق سرخ تھے رخسار
عقیدت میں جنباں تھے لب لعل و گہربار
بھر کر نفس سرد یہ فرماتے تھے ہر بار
اک پھول بھی زہرا کے چمن میں نہ ملے گا
کیا ہوگا جو پانی کسی بن میں نہ ملے گا

اردو کے دوسرے عظیم مرثیہ گو مرزا دبیر ہیں جو میر انیس کے ہم عصر تھے۔ دبیر کا پورا نام مرزا سلامت علی تھا اور والد کا نام غلام حسین تھا۔ دہلی میں پیدا ہوئے تھے لیکن بچپن ہی میں اپنے والد کے ساتھ لکھنؤ آ گئے اور ساری زندگی یہیں گزری۔

مرزا دبیر کی سب سے بڑی خوبی تشبیہات اور استعارات کا برجستہ استعمال ہے۔ وہ اکثر نادر تشبیہات اور نئے نئے استعارے پیدا کرتے ہیں۔ کبھی کبھی اس لگن میں اتنے آگے نکل جاتے ہیں کہ شعر کے معنی سمجھنے میں دقت ہوتی ہے۔ شبلی نے ان کے مرثیوں پر تذکرہ کرتے ہوئے "موازنہ انیس و دبیر" میں لکھا ہے کہ خیال آفرینی، دقت پسندی، استعارات کی جدت، اختراع، تشبیہات، شاعرانہ استدلال، شدت مبالغہ میں ان کا جواب نہیں لیکن اس زور کو وہ سنبھال نہیں سکتے۔ اس وجہ سے کہیں خامی پیدا ہو جاتی ہے، کہیں تعقید اور اغلاق ہو جاتا ہے۔ تشبیہات پھبتیاں بن جاتی ہیں۔ کہیں محض فرضی خیال رہ جاتی ہیں۔ تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان کا کلام جہاں فصاحت و بلاغت کے معیار پر بھی پورا اتر جاتا ہے، نہایت بلند رتبہ ہو جاتا ہے۔

درج ذیل اشعار میں جدت بیان ملاحظہ کیجئے:

جب سرنگوں ہوا علم کہکشاں نے شب
خورشید کے نشان نے مٹایا نشان شب

کی بہادری کے کارنامے اس طرح بیان کرتے ہیں۔ حر تلوار لے کر دشمنوں کی فوج پر ٹوٹ پڑا ہے:

رعد تھرا گیا نعرے جو سنے غنیم کے — استخوا کانپ گئے زیر زمیں رستم کے
تہہ و بالا ہوئیں دشمن کی صفیں جم جم کے — برق شمشیر سے ڈر ڈر کے فرس بھی چمکے
نوبت جنگ نہ آئی تھی کہ دل ٹوٹ گئے
بیر قیں گر گئیں ہاتھوں سے نشاں جھوٹ گئے

چھیڑ کر باگ فرس کو جو ذرا گرمایا — غیظ میں آن کے گھوڑا بھی غضب کف لایا
شیر سا فوج مخالف پہ جھپٹ کر آیا — روند ڈالا اسے دم میں جسے سرکش پایا
اس کا قاتل تھا جو دشمن شہ عالی کا تھا
کاٹ ہر نعل میں شمشیر ہلالی کا تھا

حضرت زینب کے دو کم سن بچے عونؑ و محمدؑ دشمنوں سے جنگ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ حضرت امام حسینؑ ان کی لاش اٹھا کر لاتے ہیں۔ حضرت زینب ان کی لاشوں کے پاس آتی ہیں۔ یہاں انیس نے واقعہ نگاری اور جذبات نگاری کا کمال دکھایا:

لاشوں پہ لائیں بیویاں زینب کو تھام کر — ماتم کی صف پر گر پڑی وہ سوختہ جگر
بولیں بڑھا کر دست مبارک ادھر ادھر — بچے کدھر ہیں مجھ کو کچھ آتا نہیں نظر
کیسی دھڑا دھڑا ہے یہ کیوں بین ہوتے ہیں
لوگو نہ غل مچاؤ مرے لال سوتے ہیں

ماں صدقہ جائے لو مرے زانو پہ سر رکھو — اس بے کسی میں اماں کی جانب نظر رکھو
لازم نہیں کہ ہاتھ سے تیغ و سپر رکھو — آفت میں ماموں جان کی اپنے خبر رکھو
دیکھو نہ آنچ آئے کوئی خوش خصال پر
فوجوں کی پھر چڑھائی ہے زہرا کے لال پر

کیسی نیند آئی ہے پیارو اٹھو اٹھو ماموں کے ساتھ رن میں سدھارو اٹھو اٹھو
ان پیاری پیاری آنکھوں پہ اماں نثار ہو — انگڑائیاں تو لو کہ جگر کو قرار ہو

Scanned by CamScanner

انداز کر دیتا ہے۔ بعض کو اجمالی طور پر بیان کرتا ہے اور بعض جزئیات کے بیان میں پورا زور کلام صرف کر دیتا ہے۔ میر انیس اس فن سے بخوبی واقف ہیں۔ انہوں نے واقعہ نگاری اور نظر نگاری میں اس فن سے کام لیا ہے۔ اردو شاعری پر عام پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں حسن و عشق کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ فطرت کے حسن اور اس کی رنگینیوں کو ہمیشہ اردو شاعری نے نظر انداز کیا ہے۔ لیکن یہ بات صرف وہ لوگ کہتے ہیں جو انیس کے مرثیے نہیں پڑھتے۔ حقیقت یہ ہے کہ انیس نے بعض مناظر کی ایسی تصویریں کھینچی ہیں کہ وہ اصل سے زیادہ خوبصورت اور دلآویز ہوگئی ہیں کیوں کہ اصل منظر میں انہیں جو کمی نظر آئی، انہوں نے اپنی قوت تخیل سے پوری کر دی ہے۔ صبح، شام، گرمی اور بہار وغیرہ کا اس طرح بیان کیا ہے کہ مرثیے کے دو حصے منظر نگاری کے بہترین شاہکار بن گئے ہیں۔ اردو شاعری میں کردار نگاری کی ابتداء انیس کے دادا میر حسن نے اپنی مثنوی سحر البیان میں کی تھی لیکن وہ کردار نگاری کے کامیاب نمونہ پیش نہیں کر سکے۔ ان کا سہرا میر انیس کے سر بندھا۔ کربلا کے واقعات میں بعض لوگ بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ میر انیس نے کردار نگاری میں اپنی تمام تر توجہ ان لوگوں پر مرکوز کر دی۔ انہوں نے ظالم اور مظلوم دونوں کی سیرتوں کی مکمل تصویریں پیش کی ہیں۔ خاص طور پر حضرت امام حسین اور کردار کو اس طرح پیش کیا ہے کہ کردار نگاری کی اعلیٰ ترین نمونہ بن گئے ہیں۔

زبان اور بیان کے معاملہ میں تو میر انیس کا مقابلہ کوئی اور مرثیہ گو نہیں کر سکتا ہے۔ دبستان لکھنؤ میں رعایت لفظی کا استعمال کیا گیا ہے بلکہ بہت اعتدال اور توازن کے ساتھ ان کے کلام میں یہ صفت کہیں عیب نہیں بنی بلکہ اس سے بیان میں اور حسن پیدا ہو گیا ہے۔ انیس سے پہلے پنڈت دیا شنکر نسیم نے اپنی مثنوی گلزار نسیم میں اس فن کو کمال پر پہنچا دیا تھا۔

مسعود حسن رضوی ادیب نے روح انیس میں لکھا ہے کہ انیس صاحب دو شخصوں کی گفتگو لکھتے ہیں تو الفاظ طرز کلام اور لب و لہجہ میں متکلم اور مخاطب دونوں کی عمر، صنف، سیرت، حیثیت وقتی، قلبی کیفیت، گفتگو کے موقع اور ان کے باہمی تعلقات کا لحاظ رکھتے ہیں۔

اب ہم مراثی انیس سے چند مثالیں دیتے ہیں۔ حر پہلے یزید کی طرف تھا۔ لیکن آخر میں حضرت امام حسین کے ساتھ شریک ہو گیا۔ یہ سب سے پہلا بہادر تھا جس نے لشکر یزید پر حملہ کیا اور شہید ہوا۔ انیس اس

Scanned by CamScanner

ان کے ترتیب ضمیر ہی کی مرہون منت ہے۔ انہوں نے مرثیے میں رزمیے اور سراپے لکھنے شروع کیے اور انہوں نے روایتیں بھی نظم کرنی شروع کیں۔ ضمیر کی زبان بہت صاف اور ترنم سے پڑھے جاتے تھے۔ ضمیر نے تحت اللفظ پڑھنے کی ابتداء کی۔ اس زمانہ میں دو مرثیہ گو اور تھے فصیح اور دلگیر لیکن جو شہرت اور مقبولیت خلیق اور میر ضمیر کے مرثیے کو ہوئی وہ ان دونوں کے مرثیوں کو نصیب نہیں ہو سکی۔ دلگیر کو امام بخش ناسخ سے تلمذ تھا۔ فنی لحاظ سے ان کے مرثیے کچھ بلند نہیں ہیں۔ انہوں نے مرثیوں میں کوئی جدت بھی پیدا نہیں کی۔ ان کے ہاں بین زیادہ ہیں۔ غالباً یہ مرثیہ گوئی کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ فصیح بھی ناسخ کے شاگرد تھے۔ ان کے مرثیوں میں زبان کی صفائی بندش کی چستی تو ہے لیکن درد و اثر بہت کم ہے۔

خلیق، ضمیر، دلگیر اور فصیح کی سب سے بڑی ادبی خدمت یہ ہے کہ انہوں نے اردو کے عظیم ترین مرثیہ گو شعراء یعنی میر انیس اور مرزا دبیر کے لئے میدان ہموار کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ سے لے کر فصیح تک تمام مرثیہ گو شاعر اس سنہری زمانہ کی تعمیر میں مصروف تھے جس میں انیس اور دبیر کو پیدا ہونا تھا۔

میر ببر علی انیس کو شاعری ورثہ میں ملی تھی۔ ان کے دادا میر حسن اردو کی سب سے اہم مثنوی سحر البیان کے مصنف ہیں۔ میر خلیق کا ابھی ذکر کیا جا چکا ہے۔ یہ انیس کے والد تھے۔ انیس ۱۲۱۶ھ اور ۱۲۲۰ھ کے درمیان فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ ہوش سنبھالا تو گھر میں مرثیہ گوئی کا چرچا دیکھا۔ انیس کی طرح ان کے بھائی میر مہر علی آتش اور نواب مونس نے بھی مرثیہ گوئی کی۔ لیکن ان دونوں کو قبول عام نہ مل سکا۔ میر انیس نے شاعری کی ابتداء غزل سے کی لیکن بہت جلد غزل چھوڑ کر مرثیہ کہنے لگے۔ باوجود کوشش کے اب ان کی غزلیں نہیں ملتیں۔ انیس کی سب سے بڑی خوبی ان کی قادر الکلامی ہے۔ نازک خیالات، لطیف جذبات اور مشکل فلسفوں کو سیدھے سادے الفاظ میں برجستگی اور بے تکلفی سے بیان کرتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے اور پھر وہ سننے والے کے دل و دماغ پر جو اثر پیدا کرنا چاہتے ہیں اس میں کامیاب رہتے ہیں۔ واقعہ نگاری پر انیس کو پوری قدرت ہے۔ وہ کسی واقعہ کے صرف ان جزئیات کا بیان کرتے ہیں جس سے پورا واقعہ آنکھوں کے سامنے آجائے۔ ایک مصور اپنی تصویر میں کہیں ہلکے رنگ استعمال کرتا ہے اور کہیں شوخ۔ وہ جانتا ہے کہ تصویر کے کن کن اجزاء کو نمایاں کرنے سے دیکھنے والے کے دل پر وہ اثر پیدا کر سکتا ہے جو خود اس کے ذہن میں ہے۔ شاعر یہی کام الفاظ اور انتخاب جزئیات سے لیتا ہے۔ بعض جزئیات کو وہ بالکل نظر

Scanned by CamScanner

اب تک بیشتر شاعروں نے مرثیہ گوئی کو مغفرت حاصل کرنے کا ذریعہ بنا رکھا تھا۔ اسی لئے اکثر ان کے مرثیے فن شاعری کے عام اصولوں سے کچھ حد تک آزاد ہوتے تھے۔ سودا نے سید محمد تقی نام ایک شاعر کے ایک مرثیے پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا تھا:

آپ کے مرثیئے کا ہوں قائل
خون جس سے عوام کا ہے دل
سن کے جماسے جس پر بدھوتلک
شام سے کونیں سینہ صبح تلک
لیکن افسوس صد ہزار افسوس
یہی آتا ہے بار بار افسوس
بدھو جما سمجھ جسے رو دیں
معنی اس کے نہ مجھ سے حل ہو دیں

سودا کو بنیادی اعتراض یہ تھا کہ مرثیہ گو شاعر فن شاعری کے اصولوں کی پابندی نہیں کرتا کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ ادب اور احترام کی وجہ سے کسی میں اتنی جرأت نہیں کہ ان کے مرثیئے پر اعتراض کر دے۔

سودا اور میر دونوں کے کلیات میں مرثیوں کی اچھی تعداد ہے۔ ان دونوں نے مرثیہ نگاری کی ابتداء کی اور اس فن کا انتہا تک پہنچایا لیکن اس صنف سخن کی ہیئت اور مواد میں ان دونوں اور خاص طور پر سودا کے تجربات بہت اہم اور تاریخی اعتبار سے ان کی حیثیت سے اس سنگ میل کی ہے جو ایک واضح اور صاف راستے کے تعین میں مددگار ہوتا ہے۔ ان دونوں کے بعد بھی دہلی میں شاعروں نے مرثیے لکھے لیکن ان میں کوئی قابل ذکر شاعر نہیں ہے۔

لکھنؤ میں میر خلیق پہلے شاعر ہیں جنہوں نے صرف مرثیہ گوئی میں کمال حاصل کیا۔ یہ میر حسن کے صاحبزادے تھے۔ میر غلام حسین ضاحک ان کے دادا تھے۔ میر خلیق کو شاعری وراثت میں ملی تھی۔ ان کے دادا پردادا سب نہ صرف شاعر تھے بلکہ سب نے کچھ نہ کچھ مرثیے لکھے تھے۔

خلیق نے غزل گوئی سے شاعروں کی ابتداء کی تھی لیکن بعد میں تمام توجہ صرف مرثیہ گوئی پر مرکوز کردی۔ زبان ان کے گھر کی لونڈی تھی اس لئے روزمرہ پر انہیں کمال حاصل تھا۔ ان کے مرثیوں کی زبان صاف پاکیزہ ہے۔ کہیں محاورے کی غلطی نہیں کرتے۔ تشبیہوں اور استعاروں کا بے جا استعمال نہیں کرتے۔ اسی لئے ان کے مرثیوں میں سوز و گداز اور درد و اثر ہے۔ خلیق کے ہم عصروں میں میر مظفر حسین ضمیر بھی تھے۔ یہ بھی مصحفی کے شاگرد تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مرثیے کے بہت سے اجزائے ترکیبی کی ایجاد اور

۲۔سراپا..... مرثیے کے ہیرو کے قد وقامت، خط وخال اور لباس وغیرہ کا بیان۔

۳۔رخصت..... ہیرو کا امام حسین سے جنگ کی رخصت لینا اور میدان جنگ میں جانے کیلئے عزیزوں سے رخصت ہونا۔

۴۔آمد..... ہیرو کا گھوڑے پر سوار ہو کر شان وشوکت کے ساتھ رزم گاہ میں آنا۔آمد کے سلسلے میں ہیرو کے گھوڑے کی تعریف بھی لکھی جاتی ہے۔

۵۔رجز..... ہیرو کی زبان سے اس کی نسب کی تعریف، اسلاف کے کارناموں کا بیان اور فن جنگ میں اس کی مہارت کا اظہار۔

۶۔جنگ..... ہیرو کا کسی نامی پہلوان یا دشمن کی فوج سے بڑی بہادری سے لڑنا۔جنگ کے ضمن میں ہیرو کے گھوڑے، تلوار اور دوسرے ہتھیاروں کی تعریف بھی کی جاتی ہے۔

۷۔شہادت..... ہیرو کا دشمنوں کے ہاتھ سے زخمی ہو کر شہید ہونا۔

۸۔بین..... ہیرو کی لاش پر اس کے عزیزوں، بالخصوص عزیز عورتوں کا رونا، یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اردو میں بہت کم ایسے مرثیے ہوں گے جن میں تمام اجزائے ترکیبی ملتے ہوں۔عام طور پر مرثیوں میں چند اجزا پائے جاتے ہیں۔بعض میں کچھ اجزاء کم ہوتے ہیں اور بعض کی ترکیب مختلف۔ایسے مرثیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔جن میں صرف حضرت امام حسینؓ کی شہادت پر اظہار غم کیا گیا ہے۔

اردو مرثیے کا آغاز دکن میں پندرہویں صدی کے نصف آخر میں ہوا۔ابتدائی مرثیے پانچ سات شعروں سے زیادہ کے نہیں ہوتے تھے۔محمد قلی قطب شاہ، ملا وجہی کے ہاں اسی قسم کے مرثیے ملتے ہیں۔ شاید اشرف بیابانی کی مثنوی ''نوسرہار'' دکن کا پہلا طویل مرثیہ ہے۔اس کے بعد ہمیں سیوک فائز، لطیف نوری، کاظم اور شاہی وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔

شمالی ہند میں میر اور درد سے قبل مرثیہ کہنے والوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں تھی۔ہمیں اردو شاعروں کے تذکرے میں غلام مصطفیٰ خان یک رنگ، میر امانی، خواجہ برہان الدین عاصمی، اعلیٰ علی، سید محمد تقی، نذر علی خاں گراں، مرزا علی، قلی ندیم، میر عبداللہ مسکین، حزیں اور غمگین وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔جنہوں نے مرثیے کہے ہیں۔

Scanned by CamScanner